فیض الدین احمد

امیر خسرو، حسن سجزی اور واقعۂ اسیری: چند غلط فہمیوں کا ازالہ

ابوالحسن یمین الدین امیر خسرو (۱۲۵۳ء۔۱۳۲۵ء) کا نام اسلامیانِ ہند کی ثقافتی تاریخ میں ایک سنہرے عنوان کی حیثیت رکھتا ہے۔ بلاشبہ امیر خسرو کی تاریخی سخت جانی ہفت عجائبات میں شمولیت کی مستحق ہے۔ صدیوں پر محیط مرورِ ایام کی گرد اور مورّخین کی کم نظری و غفلت شعاری بھی امیر خسرو کو ''مردہ جاوید'' نہ کر سکی۔ ابنِ بطوطہ سے لے کر محمد حسین آزاد، یہاں تک کہ موجودہ زمانے کے محققین اور جیّد اہلِ قلم نے بھی امیر خسرو کی اصل شخصیت اور کارناموں کو اب تک پوری طرح اجاگر نہیں کیا۔ ابنِ بطوطہ ۷۳۴ھ میں بعہدِ محمد تغلق ہندوستان پہنچا۔ اس نے شیخ کمال الدین غزنوی قاضی القضاۃ سے کرید کرید کر حالاتِ ماقبل دریافت کیے اور ان سے اپنے سفر نامے کے صفحات کو زینت بخشی۔ محمد تغلق کے زمانے کے جلسے جلوسوں، تقاریب، درباری ہنگامہ آرائیوں، حتیٰ کہ گینڈے اور دوسرے جانوروں تک کی رام کہانی مزے لے لے کر رقم کی مگر خسرو کے بارے میں اس کا مورّخانہ تجسس منجمد اور قلم گم صم اور خاموش رہا۔[۱] محمد حسین آزاد نے ''آبِ حیات'' مرتب کی تو اس میں بھی امیر خسرو کی شخصیت اور کارناموں کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے کہ اس کی روشنی میں علم و ہنر سے عاری ایک ایسے مسخرے اداکار کا تصوّر ابھر کر سامنے آتا ہے جو لطیفے، پہیلیاں، انملیاں اور کہہ مکرنیاں سنا کر حاضرینِ محفل کا دل خوش کرتا رہتا ہے۔[۲] جب کہ حقیقت یہ ہے کہ امیر خسرو اپنی ۷۲ برس کی زندگی میں عمر بھر حرکت و عمل کی تصویر بنے رہے۔ وہ جب تک جیے ہندوستان کے چاروں طرف گھومے پھرے، زمینوں اور زبانوں کی سیر کی، ظاہری مناظر سے چادر سرکا کر اپنے زمانے کی زیرِ تہ اور برسرِ زمین حقیقتوں کو چھو کر، برت کر دیکھا۔ نہ صرف خود دیکھا بلکہ اپنی نظم و نثر کے ذریعے ہمیں بھی دکھایا اور جو کچھ دکھایا وہ آج سات صدی بعد بھی پرانا یا از کارِ رفتہ نہیں ہوا۔ زمانے نے تقویم پلٹی، ماہ و سال کے رنگ بدلے، معاملات اور واقعات کی سطح بدلی، اصطلاحیں بدلیں، استعارے بدلے لیکن ان تمام تبدیلیوں کے باوجود مطالعۂ خسرو کی

اہمیت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ بلکہ موجودہ تناظر میں تو امیر خسرو کے ذہنی اور جسمانی سفر کی داستان، ان کے ہاں ردوقبول کا عمل، اختیار اور انکار کا مطالعہ، ہمارے لیے اور بھی بامعنی ہو جاتا ہے۔ ان کی تحریریں شعری اور نثری ادبیات کے علاوہ سماجی اتھل پتھل، سیاسی عروج و زوال، تہذیبی آداب و اطوار، گویا تاریخ کے ہر پہلو سے کچھ نہ کچھ ہم تک پہنچاتی ہیں اور ہمارے تاریخی شعور میں اضافے کا سبب بنتی ہیں۔[۳]

امیر خسرو ۹۹ تصانیف کے خالق اور بنیادی طور پر فارسی کے شاعر اور عالم تھے۔[۴] ان میں صرف ۴۵ تصانیف کا سراغ اب تک مل سکا ہے۔[۵] امیر خسرو کی ہندی یا ہندوی (اردو) شاعری تحقیق کا خاصا دقت طلب مسئلہ ہے۔ اس راہ میں ہر قدم بحث کی نئی راہ کھولتا ہے۔[۶] ''ان کا جو کچھ اردو کلام آج ملتا ہے اس میں امتدادِ زمانہ سے اتنی تبدیلیاں ہوچکی ہیں کہ اب اسے مستند نہیں مانا جاسکتا۔''[۷] ہندی، اردو یا ہندوستانی میں جو موجودہ لسانی مفاہیم ہم نے وابستہ کر لیے ہیں، تیرھویں صدی میں ان لسانی مفاہیم کا تصور موجود ہی نہیں تھا۔ علاء الدین خلجی کا عہد امیر خسرو کے انتہائی عروج کا زمانہ ہے۔ ان کی زیادہ تر تصنیفات اسی دور میں مکمل ہوئیں۔[۸] ان کے اشعارِ ریختہ کو پڑھ کر زبان و بیان کے لہجے، آہنگ، طرز اور ساخت سے واضح طور پر یوں محسوس ہوتا ہے کہ دو کلچر ایک دوسرے کے گلے مل رہے ہیں اور اس امتزاج سے ایک تیسرے کلچر کی بنیادیں استوار ہو رہی ہیں۔[۹] ہمارے ادب کے ابتدائی نقوش خسرو کے کلام کے ذریعے ہی سامنے آئے۔ ان کا ہندی کلام ہمارے قومی شعر و ادب کا نقش اوّل ہے۔ اردو ہندی، ہندوستانی یا کھڑی بولی کی پہلی واضح شکل ہمیں خسرو ہی کی شاعری میں نظر آتی ہے۔[۱۰]

ان کی تصانیف کا مطالعہ:

> ہندوستان کی تیرھویں اور چودھویں صدی کی ایسی تصویر پیش کرتا ہے جس میں ملک کی مِلواں جلواں تہذیب کے نقش صاف نظر آتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہندوستانی مسلمان عالم، شاعر اور ادیب اس زمانے میں کیسے جذبے، کیسے خیال رکھتا ہے۔ اسے ہندوستان کے ساتھ کیسی والہانہ محبت تھی اور وہ کس طرح اپنے وطن کو تمام دنیا کے ملکوں پر جن میں اسلامی دنیا شامل تھی، ترجیح دیتا تھا، اس کے دل و دماغ پر ہندوستان کا کتنا گہرا اثر تھا اور ہندوستانی فضا کس قدر اس کے ذہن پر چھائی ہوئی تھی۔[۱۱]

ان کی ہندوی شاعری کی روایت کی توثیق، ان کے اپنے دور سے آج تک مختلف ذرائع سے ہوئی ہے۔ ان کی

شاعری کے نمونے آج سے ساڑھے چار سو سال پہلے کی تصانیف میں موجود ہیں۔[۱۲] اردو شعرا کے تذکروں میں بھی ان کے کلام کے نمونے ملتے ہیں۔ اس بات پر تو سب ہی متفق ہیں کہ خسرو بہت بسیار نویس تھے۔ ڈاکٹر وحید مرزا کے مطابق ''خسرو نے اپنے مجموعی کلام کا کہیں کوئی اندازہ نہیں لکھا۔ اگرچہ دولت شاہ نے لکھا کہ خسرو اپنے اشعار کی مجموعی تعداد چار لاکھ بیت سے زائد اور پانچ لاکھ سے کم بتاتے ہیں۔''[۱۳] شبلی اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ:

> ہندوستان میں چھے سو برس سے آج تک اس درجے کا جامعِ کمالات نہیں پیدا ہوا۔ اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع، ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کیے ہوں گے... امیر صاحب [کذا] کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں... اس میں غالباً ایک غلط فہمی ہے۔ امیر صاحب نے ابیات کا لفظ لکھا ہے اور قدما کے محاورہ میں بیت ایک سطر کو کہتے ہیں۔[۱۴]

ان کے اشعار کی درست تعداد کے تعین سے قطع نظر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ وہ زود نویس شاعر تھے۔ اسی لیے ان کے انتقال کے دوسو برس بعد مرزا بایسنغر نے بہت کوشش اور جستجو کے بعد ایک لاکھ بیس ہزار بیت جمع بھی کر لیے۔[۱۵] ان سب پر مستزاد یہ کہ اوحدی نے تذکرۂ عرفات میں لکھا کہ امیر خسرو کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اسی قدر برج بھاشا میں ہے۔[۱۶] ان کی ہندی دانی میں کوئی شک نہیں۔ ترکی اور فارسی تو ان کی اصلی زبان ہے۔ عربی میں بھی ادبائے عرب کے ہمسر ہیں۔[۱۷] لیکن یہ بھی ذہن میں رہے کہ ان کی ماں ہندوستانی نسل سے تھیں۔[۱۸] وہ ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے وہ مثنوی نُہ سپہر میں کہتے ہیں کہ:

ہندست مرا مولد و ماویٰ و وطن[۱۹]

اس مثنوی کا سب سے بڑا اور تیسرا باب مکمل طور پر ہندوستان کی تعریف میں ہے جس میں تقریباً چار پانچ سو اشعار ہیں بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ انھوں نے اپنی پدری زبان ترکی اور فارسی پر ہندوی کو ترجیح دی ہے۔ اس بات کی تائید خسرو کے اس شعر سے بھی ہوتی ہے:

اثبات گفت ہند بہ حجّت کہ راجح است
بر پارسی و ترکی از الفاظِ خوش گوار[۲۰]

ان کے ہندوی کلام کے بارے میں سب سے مضبوط دلیل ان کے تیسرے دیوان غرۃ الکمال کا دیباچہ ہے۔ یہ دیوان ۶۹۳ھ میں مرتب ہوا۔ اس وقت خسرو کی عمر ۴۳ برس تھی۔[۲۱] اس دیباچے میں وہ کہتے ہیں کہ:

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن[۲۲]

لیکن ان تمام دلائل کے باوجود ان کے ہندوی کلام کی تعداد کے حوالے سے اوحدی اور دیگر متقدمین کا بیان مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ بدقسمتی سے اب تک کی تحقیقات کے مطابق ان کے محض چار پانچ سو ہندوی اشعار ہی ہماری ادبی تاریخ میں زندہ ہیں۔ اس میں مشہور زمانہ متنازع فیہ کلام خالق باری بھی شامل ہے جس کو حافظ محمود شیرانی، خسرو کی تصنیف ماننے سے انکاری ہیں۔[۲۳] اس کے باوجود کہ اقبال صلاح الدین اور ان کے ہم خیالوں نے حافظ محمود شیرانی کے نظریے کے خلاف اعتراضات اٹھائے ہیں۔[۲۴] حقیقت بھی یہی ہے کہ امتدادِ زمانہ سے اس کتاب میں اس قدر الحاق و اضافے ہوئے ہیں کہ آج یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ ان میں سے کون سے اشعار امیر خسرو کے لکھے ہوئے ہیں۔ محققین کا ایک گروہ اسے امیر خسرو کی تصنیف قرار دیتا ہے اور دوسرا اسے ضیاء الدین خسرو کی تصنیف بتاتا ہے۔ پہلے گروہ کے نمائندے محمد امین عباسی اور دوسرے کے ترجمان حافظ محمود شیرانی ہیں۔[۲۵] اس بابت ڈاکٹر جمیل جالبی کی بات درست معلوم ہوتی ہے کہ:

> یہ دونوں زاویہ نظر انتہا پسندانہ ہیں۔ شیرانی صاحب یہ بھول گئے کہ امیر خسرو نے اپنا سارا ہندی کلام تفنن طبع کے طور پر لکھا تھا اور اس میں وہ سنجیدگی اور توجہ مفقود ہے جو فارسی میں ان کا طرۂ امتیاز ہے۔[۲۶]

اگر متنی تنقید کے اصولوں کو مدنظر رکھ کر ان کے کلام کا جائزہ لیا جائے اور ان کے تمام الحاقی کلام کو نکال دیا جائے تو ان کے اشعار کی تعداد دو سو تک بھی بہ مشکل رہ پائے گی۔ ''خسرو جیسے عظیم شاعر کا اتنا بڑا ذخیرۂ کلام ضائع ہو جانا ایک جاں کاہ ادبی سانحہ ہے جس کے لیے وقت کی بدعنوانیوں کو کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔''[۲۷] بہرحال زمانے کی دست برد اور ادبی بدعنوانی کے بعد خسرو کا جتنا بھی ہندی کلام ہماری دسترس میں ہے وہ بھی غنیمت ہے اور ہمارا قومی اثاثہ ہے۔[۲۸] امیر خسرو کا ہندوی کلام اگر ضائع نہیں ہوتا تو اردو شاعری اس عہد کی تاریخ اور سیاسی کش مکش کے ادبی اظہار سے محروم نہ رہتی کیوں کہ وہ بہت سے بادشاہوں کے مصاحب رہے اور ان حکمرانوں کے عروج و زوال کو بہت قریب سے دیکھا۔ ڈاکٹر تارا چند کے مطابق انھوں نے ''بہتر برس کی عمر میں سات سلطانوں کا زمانہ دیکھا۔''[۲۹] جب کہ شیخ سلیم احمد کا کہنا ہے کہ انھوں نے ''غیاث الدین

بلبن کے زمانے سے محمد شاہ تغلق کے عہد تک گیارہ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور سات بادشاہوں کی ملازمت اور مصاحبت کی۔''[۳۰] خاندانِ غلاماں کی بااقبال سلطنت کا چراغ ان کے سامنے گل ہوا۔ خاندان خلجی کے عروج و زوال کو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ مشہور مؤرّخ سر ایلیٹ کی رائے ہے کہ خسرو ایسے زمانے میں ہوا ہے کہ جب ہندوستان میں اخلاق کا خون ہو رہا تھا۔[۳۱] ان تمام پہلوؤں کو امیر خسرو کی فارسی شاعری میں بہ آسانی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ غور سے دیکھنے والوں کو یہ ہندوستان کی تاریخ کا سیاہ ترین دور نظر آتا ہے۔ اس تاریک دور میں ہندوستان میں مسلسل کشت و خون اور سازشیں جاری تھیں۔ اس طوائف الملوکی کو اکثر یورپین مورخوں نے قصاب کی دکان کے نام سے موسوم کیا ہے۔[۳۲]

امیر خسرو نے جو دور پایا تھا وہ ہندوستان میں ترقی کرتی ہوئی ابتدائی مسلم سلطنت کا دور تھا۔ اس دور کا المیہ یہ تھا کہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں سیاسی اور معاشرتی سطحوں پر متضاد قوتیں باہم برسرِ پیکار تھیں۔ معاشرے میں شکست و ریخت نے عجیب طرح کا اضمحلال پیدا کر دیا تھا۔ امیر خسرو پر الزام یہ ہے کہ انھوں نے دربار سے وابستہ رہ کر بادشاہوں کی شان میں قصائد لکھے لیکن ان الزامات کی اس وقت کوئی حقیقت نہیں رہتی جب ہم ان کی مثنویوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ عاشقہ، آئینہ سکندری، مطلع الانوار اور دیگر بہت سی مثنویوں میں وہ شاہانِ وقت کو پند و نصیحت اور ان کی بے اعتدالیوں پر نکتہ چینی کرتے نظر آتے ہیں۔[۳۳] اگر کچھ دیر کے لیے یہ مان بھی لیا جائے کہ انھوں نے ظالم و جابر حکمرانوں کی مدح کی ہے تو اس کی تاویل یہ پیش کی جا سکتی ہے کہ اگر خسرو یہ نہ کرتے تو دربار سے کس طرح وابستہ رہتے۔ ان کا ذریعۂ معاش کیا ہوتا، معاشی بد حالی کے نتیجے میں جو کچھ فنی صلاحیت تھی، وہ بھی مفقود ہو جاتی۔ انھیں کیسے موقعہ ملتا کہ چھے ماہ تک پوری یکسوئی کے ساتھ قران السعدین جیسا فنی شاہ کار تصنیف کریں۔[۳۴] وہ مصاحبتِ شہ پر کبھی فخر نہیں کرتے اور نہ ہی نوکر ہونے پر شہ کو دعائیں دیتے ہیں بلکہ وہ تو اپنی درباری زندگی سے ہمیشہ شاکی نظر آتے ہیں۔[۳۵] بادشاہوں کی بے اعتدالیوں اور بے راہ روی پر شاید ہی کسی شاعر نے زمانے میں اتنی سخت پکڑ کی ہو جیسی پکڑ خسرو کے یہاں نظر آتی ہے۔ مثنویوں کے ساتھ ساتھ قصائد میں بھی وہ پند و نصیحت سے باز نہیں آتے۔ انھوں نے ہمیشہ عوامی فلاح و بہبود پر زور دیا۔ ان کا آزاد رویہ ان کے فارسی کلام میں بہت نمایاں ہے۔[۳۶] تغلق نامہ میں ان کے لہجے کی بے باکی دیکھیے۔ سو اشعار تک یہ سلسلہ چلتا ہے:

چوں خدایت سریرِ شاہی داد ملک از ماہ تا بہ ماہی داد
برستمکش ز عدل کم نہ کنی برستمگار جز ستم نہ کنی

خارِ بن را بر افگنی ز گرز خار کن را کُنی نہال ز سر
چوں بہ پیلاں علف دہی حالی از غم مور دل مکن خالی

اور آخری شعر میں کہتے ہیں کہ:

درچہ کس نیست دشمنِ تن تو
غفلتِ تو بس است دشمنِ تو(۳۷)

پند و نصائح کا یہ سلسلہ امیر خسرو کے انسان دوست نقطۂ نظر کی پوری طرح عکاسی کرتا ہے۔ ایک جرأت مندانہ نصیحت سلطان قطب الدین خلجی کی تباہی کے لیے بروقت پیشین گوئی کی حیثیت رکھتی ہے۔(۳۸) وہ کہتے ہیں:

شراب و عشق و مستی و جوانی نشاط و عیش و ملک و کامرانی
کسے کیں بادشاہ افتاد در خویش کے اندیشہ کند اندیشۂ بیش [کذا]
نشاید پادشا را مست بودن نہ در عشق و ہوس پیوست بودن
بود شہ پاسبانِ خلق پیوست خطا باشد کہ باشد پاسباں مست
شہاں چوں شد خراب از بادۂ ناب رمہ در معدۂ گر گاں کُند خواب(۳۹)

امیر خسرو کے زمانے کا تفصیلی جائزہ لیا جائے تو نظر عبرت سے دیکھنے والوں کو دنیا میں مکافاتِ عمل سے نصیحت اور عبرت حاصل کرنے کا موقع ملے۔ برصغیر کی تاریخ ایسے سانحات سے بھری ہوئی ہے۔ مسلم اقتدار کے ابتدائی دور سے آج تک ایسی بے شمار مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں مثلاً کیقباد نے اپنے چچا زاد بھائی کیخسرو کو بے قصور قتل کرایا اور دوسرے سال اسے بھی یہی روز بد دیکھنا پڑا۔ جلال الدین خلجی نے سید مولیٰ کو شہید کرا کے اپنی نیک نام سلطنت پر بدنما دھبّا لگایا لیکن اس کے بعد وہ زیادہ عرصے تک اطمینان سے اپنے سلطنت کے امور نہ چلا سکا اور خود بھی اسی مصیبت میں گرفتار ہوا۔ علاء الدین نے اپنے محسن چچا سے جو افسوس ناک برتاؤ کیا اس کی سزا اس کی اولاد کو ملی۔ کافور اپنی نمک حرامی سے فوراً ہی دنیا سے کافور ہو گیا۔ قطب الدین نے خضر خاں اور شادی خاں وغیرہ کے قتل سے اپنے ہاتھوں کو رنگا، اس کی شامت اعمال سے جلد اس کا خاتمہ بھی بدترین طریقے سے ہوا۔ خسرو خاں کی نمک حرامی نے خسروی کی آرزو میں اپنی عزیز جان کو بھی کھویا۔(۴۰)

خسرو کی شاعری بھی اس دور کی آئینہ دار ہے۔ ان کے کلام میں تیرھویں اور چودھویں صدی کے ہندوستان کی ذہنیت کا بھرپور عکس دکھائی دیتا ہے۔ اس زمانے کی سیاست، اخلاقی اقدار اور ناکامیوں کا المیہ دیکھنا ہو تو خسرو کی شاعری اس کا بہترین نمونہ ہے۔(۴۱) ان کی تاریخی مثنویوں میں اس عہد کی ثقافتی اور سماجی زندگی کے بارے

میں جو سرمایہ موجود ہے وہ ہر اعتبار سے بے نظیر ہے۔[۴۲] سید حسن عسکری کے مطابق:

> Amir Khusro's histrorical works have defects and merits of their own. His isolated fragments of historical continuum of about four decades, couched in a highly artificial, affected and obscure language and style cannot be put in comparison with the works of other medieval historians.[43]

یہاں اس بات کی گنجائش تو نہیں کہ ان مثنویوں میں موجود تمام حادثات و سانحات کو تفصیل سے پیش کیا جائے لیکن چند اہم واقعات کا بیان یہاں ناگزیر ہے تاکہ اس دور کے اہم سانحات اور اس کا منظر نامہ واضح ہوجائے۔ ان میں سے ایک اہم واقعہ شہزادہ محمد سلطان کی شہادت کا ہے۔ مؤرّخین نے اس سانحے کو تفصیل سے بیان تو کیا ہے لیکن واقعات کے بیان میں ان کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ شہزادہ محمد سلطان جو سلطان غیاث الدین بلبن کا ولی عہد اور ملتان کا حاکم تھا، اپنی اس کی سعادت مندی کی وجہ سے بلبن کو بے حد عزیز تھا۔ وہ بہت بہادر، نیک طینت، شریف اور شائستہ انسان تھا۔ وہ علما و فضلا اور بزرگانِ دین کی بڑی عزت کرتا تھا۔[۴۴] اس کی علم دوستی اور ادب نوازی سے متاثر ہوکر امیر خسرو نے اس کے دربار سے وابستہ ہونے کا فیصلہ کیا۔ امیر خسرو کے ہم راہ امیر حسن سجزی بھی شاہ زادہ کی ملازمت میں داخل ہوئے۔[۴۵] جنھیں شاہزادہ محمد نے دوات داری کا منصب عطا کر کے عزت و اکرام سے نوازا۔ آپ کا نام نجم الدین اور تخلص حسن تھا۔[۴۶] امیر خسرو اور سید حسن سجزی کی دوستی ایسی مثالی اور مشہور تھی کہ دونوں ایک جان دو قالب سمجھے جاتے تھے۔ ملتان کے دربار میں خسرو کے بعد سب سے زیادہ مشہور شاعر حسن سجزی ہی تھے۔ غزل گوئی میں تو ان کو ملکہ حاصل تھا۔ اسی مناسبت سے انھیں ''سعدیٔ ہند'' بھی کہا جاتا تھا۔[۴۷] یہ خطاب انھیں عبدالرحمٰن جامی نے دیا۔[۴۸] خسرو کی طرح حسن نے بھی غالباً ہندی میں شعر کہے ہوں گے لیکن اب تک ان کا کوئی قابلِ ذکر ہندی کلام سامنے نہیں آیا۔ غالباً مولانا شیرانی نے ہندوی کے ایک آدھ شعر کو ان سے منسوب کیا ہے جیسے:

شاہاں کندت چاکری یہ جیو تجسو گو ملے
گو بہ حسن یہ ریختہ سنسار دیکھو کیوں چلے[۴۹]

ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی ان کی ایک غزل کے چند اشعار نقل کیے ہیں جس سے اس دور کی زبان پر روشنی پڑتی ہے۔ انھوں نے بھی فارسی اور ہندی کو ملا کر وہی طریقہ اختیار کیا ہے جو امیر خسرو کے کلام کی خصوصیت ہے جیسے:

ہر لحظہ آید دردلم دیکھوں اسے ٹک جائے کر
گویم حکایت ہجر خود یا آں صنم جیو لائے کر

بس حیلہ کر دم اے حسن جانا شدم از دم بدم
کیسے رہوں تجھ جیوں بن تم لے گئے سنگ لائے کر[۵۰]

یہ دونوں اصحاب پانچ برس تک ملتان میں شہزادہ محمد سلطان کی مصاحبت میں رہے۔ ان دنوں خطۂ ملتان ان اصحاب کے فن کی وجہ سے رشکِ گلستانِ ارم ہو رہا تھا۔[۵۱]

غیاث الدین بلبن کے اس جواں سال کی حکومت ہندوستان میں مستحکم ہونے کے بعد سب سے اہم سانحہ جو اس عہد میں پیش آیا، وہ لکھنوتی کے صوبے دار طغرل کی بغاوت تھی۔ ۶۷۸ھ میں طغرل نے وہاں کے راجا کو شکست دے کر مالِ غنیمت اور شاہی حصہ بھی ہضم کرلیا۔ اس بے وفا غلام نے ملک پر قبضہ کرنے کے ساتھ ساتھ سرخ رنگ کا چتر بھی سر پر سایہ فگن کیا اور اپنے آپ کو سلطان مغیث الدین کے خطاب سے لکھنوتی کا بادشاہ مشہور کیا۔ بلبن نے اس بغاوت کی سرکوبی کی۔ طغرل قتل ہوا۔ نہ صرف طغرل بلکہ لکھنوتی پہنچ کر بلبن نے حکم دیا کہ بازارِ شہر کے دونوں طرف پھانسیاں لٹکائی جائیں۔ اس کے بعد طغرل کے تمام حاشیہ نشینوں کو نذرِ اجل کیا۔ اس کے بعد بلبن نے اپنے بیٹے شہزادہ محمد سلطان شہید کو کچھ نصیحتوں کے ساتھ امارت اور بادشاہی سے سرفراز کیا۔[۵۲] تخت نشینی کے وقت سے لے کر شہادت تک شہزادہ محمد کو کبھی بھی اطمینان وسکون کا سانس لینے کا موقع نہ مل سکا۔ اسے مغل حملہ آوروں کا مقابلہ کرنے کے لیے آئے دن میدانِ جنگ میں جانا پڑتا تھا۔ خسرو کے دیوان وسط الحیوٰۃ میں درج چند نظمیں ان واقعات پر بھرپور روشنی ڈالتی ہیں، ان نظموں کو دیکھنے سے اندازہ ہوجاتا ہے کہ اس زمانے میں مغلوں کا خطرہ ہر وقت سر پر منڈلاتا رہتا تھا۔ جیسے:

کوہ غم برداشت از پیش دِلم چوں مژدہ داد　　کز غزائے کن کہ خاقانِ مظفّر بازگشت
کافرِ بدکیش ہر تیرے کہ سوئے دیں کشاد　　سہم تو بارے بروزے ہم بکافر بازگشت

خاکِ ملتاں ہر زماں بر آب دیگر می شود
چوں بہ چاہے ہم چو دریاے ملتاں می رسد[۵۳]

خسرو نے بہ حیثیت مؤرّخ، اس زمانے کے حالات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی پانچ تاریخی مثنویوں قران السعدین، مفتاح الفتوح، عشقیہ یا دولرانی خضر خاں، نُہ سپہر اور تغلق نامہ وغیرہ میں گہرے تاریخی شعور کا پتا چلتا ہے۔ دیوان وسط الحیوٰۃ میں مثنوی نُہ سپہر اور دیگر شعری مجموعوں میں درج نظمیں مذکورہ واقعات پر بھرپور روشنی ڈالتی ہیں۔[۵۴]

مغل اپنی سابقہ شکستوں کا بدلہ لینے کے لیے اکثر حملے کرتے۔[۵۵] اس صورت حال میں شہزادے کو

ہر وقت مستعد رہنا پڑتا۔ مغل رہزنوں کی طرف سے ایسا ہی ایک شدید حملہ اخیر ۶۸۳ ھ میں کیا گیا۔[۵۶] ظ انصاری لکھتے ہیں کہ شہزادہ محمد نے پوری تیاری کے بغیر دریائے راوی پار کیا اور جان ہتھیلی پر رکھ کر دشمنوں کو کچھ دور تک پسپا کر دیا۔[۵۷] اس نے انتہائی بہادری سے مغل رہزنوں کو موت کی گھاٹ اتارا۔ اس زمانے میں ارغون خاں ایاق خاں بن ہلاکو خاں ایران کے تخت سلطنت پر بیٹھا ہوا تھا۔ تیمور خاں جو بہت نام ور چنگیزی امیر اور قندھار، بدخشاں، غزنی اور بامیان وغیرہ کا حاکم تھا، اپنے عزیزوں اور ہم قوموں کا بدلہ لینے کے لیے بیس ہزار مغلوں کے ساتھ لاہور اور دیپال پور اور اس کے گرد و نواح کو تاخت و تاراج کرتا ہوا ملتان کی طرف بڑھا۔[۵۸] اس حملے کی اطلاع جب شہزادہ محمد کو دی گئی تو محمد سعید احمد مارہروی کے مطابق ''اس نے اپنے دربار میں بتیس ہزار فوج کو تین ہزار پڑھا''[۵۹] جب کہ پروفیسر محمد حبیب نے لکھا کہ سلطان محمد کو اس مقابلے میں عجیب دھوکا ہوا۔ مغلوں کی آمد کی جو اطلاع دی گئی تھی، اس میں تیس ہزار درج تھا جس کو غلطی سے تین ہزار پڑھا گیا۔[۶۰] درست صورت حال یہ ہے کہ اس پیغام میں بتیس (۲۳) ہزار نہیں بلکہ تیس (۳۰) ہزار ہی درج تھا جس کی تائید ملا عبدالقادر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

۱۰۰۰ یتمر مغول باسی ہزار سوار آب راوی را از گذر... مضمون بخان شہید فرستاد او در مجلس خویش سی ہزار راسہ ہزار خواندہ۔[۶۱]

شہزادہ محمد مغل لشکر کی سرکوبی کے لیے روانہ ہونے کے چند ہی گھنٹوں بعد دریاے راوی (لاہور) تک پہنچ چکا تھا۔ تیمور خاں نے پیش دستی کی اور دریا عبور کر کے شہزادے کے لشکر پر حملہ آور ہوا۔ گھمسان کی لڑائی ہوئی اور کئی مغل سردار اس معرکے میں کام آئے۔ تعداد میں کم ہونے کے باوجود ہندوستانی فوج نے مغلوں کے دانت کھٹے کر دیے تھے لیکن بھاگتے ہوئے مغلوں کے تعاقب میں شہزادے کی فوج نے دور اندیشی کو خیر باد کہا اور شہزادے کے پاس محض پانچ سو سپاہیوں کی جماعت رہ گئی۔ ظہر کے وقت جب یہ لوگ نماز کی ادائیگی میں مصروف تھے، مخالف سمت سے مغلوں کے ایک تازہ دم دستے[۶۲] جو کمین گا میں چھپا ہوا تھا،[۶۳] نے ہندوستانی فوجیوں کو موت کی گھاٹ اتارنا شروع کر دیا۔ حملہ اچانک ہوا اور مغلوں کی تعداد بھی دو ہزار تک تھی لہٰذا شجاعت اور جواں مردی سے لڑنے کے باوجود ایک ایسا سانحہ رونما ہوا جس نے بلبن کی سلطنت کو ہلا کر رکھ دیا۔ بدقسمتی سے اس لڑائی میں ایک تیر شہزادہ محمد کو آ کر لگا۔ زخم اس قدر شدید تھا کہ شہزادہ فوراً گر پڑا اور اس کی روح اس دنیا سے پرواز کر گئی۔ اس سانحے نے ہندوستانی فوج کی کمر توڑ کر رکھ دی۔ فوج میں بھاگڑ مچ گئی اور مغلوں نے بھاگتے ہوئے ہندوستانیوں کو چن چن کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ شاہی خیمے کو تاخت و تاراج کر

کے اور سینکڑوں قیدیوں کو گرفتار کر کے مغل واپس روانہ ہوئے۔[۶۴] شہزادہ محمد کی شہادت کے بعد امیر خسرو بھی مغلوں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔[۶۵] مولانا شبلی نعمانی ''بیانِ خسرو'' میں کہتے ہیں کہ ''اس معرکے میں امیر خسرو اور خواجہ حسن دہلوی بھی شریک تھے۔[۶۶] پروفیسر شفقت رضوی نے بھی مذکورہ تصنیف کے حوالے سے کہا کہ ''شبلی نے شبہ ظاہر کیا ہے کے حسن سجزی بھی گرفتار شدگان میں شامل تھے۔''[۶۷] دیوانِ حسن سجزی کے مرتّب مسعود علی محوی نے شبلی کی تائید کرتے ہوئے لکھا کہ میر حسن دہلوی غالباً اس معرکے میں شریک تھے۔''[۶۸] یہ تائید بھی محض شبلی سے عقیدت کی وجہ سے تھی۔ انھوں نے تحقیق کے بنیادی اصولوں کو بالائے طاق رکھ کر ''خطائے بزرگاں گرفتن خطا است'' کی مصداق شبلی کی بات پر آنکھ بند کر کے یقین کرلیا۔ ان کی اس عقیدت کا اظہار ان جملوں سے بھی ہوتا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ ''ہمارے مکرم استاد مولانا شبلی مرحوم نے ''حیاتِ خسرو'' [کذا: بیان خسرو] میں ایک فقرہ تحریر فرمایا ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ حسن کو بھی تاتاری گرفتار کر کے بلخ لے گئے تھے... غالباً مولانائے موصوف نے کسی سند کی بنیاد پر ایسا تحریر فرمایا ہوگا جس سے ہم ناواقف ہیں۔''[۶۹] مسعود علی محوی صاحب نے بیان خسرو میں موجود جس فقرے کی طرف اشارہ کیا ہے، راقم مذکورہ سطور میں اسے درج کر چکا ہے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ بیان خسرو کی اشاعت سے قبل خسرو کے بارے میں یہی معلومات من وعن شعر العجم، حصہ دوم میں بھی شائع ہوچکی تھیں۔[۷۰] بیان خسرو میں سن اشاعت موجود نہیں لیکن شواہد یہ بتاتے ہیں کہ یہ کتاب شعر العجم کی اشاعت ۱۳۲۵ھ کی اشاعت کے بعد شائع ہوئی۔ اس کی ایک واضح دلیل یہ ہے کہ بیان خسرو کے سرورق کے بعد مضمون کے آغاز سے قبل ایک صفحے پر ''شبلی کی مشہور تصانیف'' کے عنوان سے جو فہرست دی گئی ہے اس کے چوتھے نمبر پر شعر العجم کا اشتہار موجود ہے۔[۷۱] اس کے علاوہ محوی صاحب کا یہ کہنا کہ بیان خسرو میں سند یا حوالہ درج نہیں، سراسر غلط ہے کیوں کہ ان دونوں تصانیف میں شبلی نے سہواً ملا عبد القادر بدایونی کا حوالہ بھی دیا ہے۔[۷۲] شبلی کے مذکورہ بالا بیان کو خان بہادر تقی محمد خان خورجوی نے بھی بغیر حوالے کے لفظ بہ لفظ درج کیا ہے۔[۷۳] اقبال صلاح الدین نے بھی شبلی کا حوالہ دیتے ہوئے اس معرکے میں حسن سجزی کی موجودگی کی تائید کی ہے۔[۷۴] ممتاز حسین نے بھی حسن سجزی کے بیان میں ملا عبد القادر بدایونی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کے ''اس معرکے میں امیر حسن بھی گرفتار ہوئے۔''[۷۵] حیرت کی بات یہ ہے کہ ان تمام لوگوں نے بدایونی کے بیان کردہ جملے کی صداقت کو جانچنے کی کوشش نہیں کی اور محض شبلی نعمانی کے بیان کردہ جملے کو درست مان کر یقین کرلیا۔ بدایونی کے تصنیف منتخب التواریخ کا مطالعہ کرتے ہوئے راقم کی نظر سے ایسا کوئی جملہ نہیں

گزرا جس سے میدان جنگ میں حسن سجزی کی موجودگی کا پتا چلتا ہو البتہ ملّا عبدالقادر نے یہ ضرور لکھا کہ اس اندوہ ناک سانحے کے بعد میر حسن دہلوی نے ایک مرثیہ نثر میں لکھ کر دہلی بھیجا۔(۷۶)

اصل فارسی عبارت ملاحظہ کیجیے:

''میر حسن دہلوی مرثیۂ نثر انشا نمودہ بدہلی فرستادو در اینجا بجنس نقل کردہ می شود۔''(۷۷)

اس مرثیے میں حسن دہلوی نے کہیں بھی اپنی گرفتاری کا ذکر نہیں کیا جس کا اعتراف خود ممتاز حسین نے بھی کیا ہے۔(۷۸) بھلا یہ کیوں کر ممکن ہے کہ کوئی شخص اس معرکے میں شریک ہو اور گرفتار ہوا ہو لیکن وہ ان واقعات کے بیان میں اپنا ذکر تک نہ کرے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر معین الدین عقیل نے بھی تاریخ فیروز شاہی کا حوالہ دیتے ہوئے سہواً یہ لکھا ہے کہ ''اس لشکر میں خسرو اور حسن سجزی بھی ہم رکاب تھے۔ شہزادہ (محمد) کی شہادت کے بعد مغل ان دونوں کو قید کر کے اپنے ساتھ لے گئے۔''(۷۹) انھوں نے لاہور سے شائع ہونے والے مترجم ڈاکٹر معین الحق کی مذکورہ تاریخ فیروز شاہی کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بھی لکھا کہ ''یہ حادثہ بروز جمعہ ذی الحجہ ۶۸۳ھ/ ۱۲۸۴ء کے آخری اور ۶۸۴ھ/ ۱۲۸۵ء کے پہلے دن پیش آیا۔''(۸۰) راقم نے جب تاریخ فیروز شاہی کا مطالعہ کیا تو امیر حسن سجزی کے بیان میں برنی نے کہیں بھی ان کی گرفتاری اور قید ہونے کا ذکر نہیں کیا ہے(۸۱) جب کہ خسرو کے حوالے سے یہ ضرور لکھا ہے کہ ''اس جنگ میں خسرو مغلوں کے ہاتھ قید ہوئے۔''(۸۲) دل چسپ بات یہ ہے کہ اس سانحے کے حوالے سے ڈاکٹر معین الدین عقیل نے جو سنہ درج کیا ہے، مذکورہ ترجمے میں وہ سن بھی درست نہیں لکھا گیا بلکہ مترجم ڈاکٹر سید معین الحق نے سہواً ۶۸۴ھ کے بجائے ۷۸۴ھ کا سنہ درج کیا ہے(۸۳) غالباً سہو کاتب کی وجہ سے ایک صدی کا فرق آیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ڈاکٹر معین عقیل صاحب نے مذکورہ سنہ کہاں سے درج کیا۔ دراصل اس واقعے کی تاریخ اور سن خود امیر خسرو نے دیوان وسط الحیات میں بیان کیا ہے جو بعینہٖ وہی ہے جو معین عقیل نے درج کیا ہے۔(۸۴) غالباً انھوں نے خسرو کے اسی دیوان سے یہ سن درج کیا ہوگا۔ اس واقعے کے درست تاریخ اور سن کے تعین کے لیے ایک اور معتبر حوالہ خود حسن سجزی کا منثور مرثیہ ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ:

> ۶۸۳ھ ماہ ذی الحجہ کی آخری تاریخ کو جمعہ کے روز جب آفتاب، لشکرِ اسلام کی معیت میں، تیغ زناں (پردۂ تاریکی سے) برآمد ہوا... اس (شہزادہ محمد) کی طبعِ مشکل کشا پر جب یہ بات کھلی کہ تمرِ ملعون اپنے لاؤ لشکر سمیت تین فرسنگ کے فاصلے پر خیمہ زن ہو چکا ہے تو اس نے صبح ہوتے ہی اس طرف

> پیش قدمی کی... وہ شاہ دین پناہ... تمام قلب سپاہ کے ہم راہ اس گروہِ گم راہ کے ساتھ، از نیمروز تا شبا نگاہ، بلا جبر وکراہ، جنگ کرتا رہا... عین اسی عنا اور اسی اثنائے آشوبِ بلا میں اچانک ایک تیر شستِ قضا سے نکل کر اس شہبازِ فضائے غذا کے شہپر پر لگا اور اس کا طائرِ روح قفسِ عنصری سے گلستانِ جنان اور بوستانِ رضوان کی طرف روانہ ہوا... ٹھیک غروب کے وقت اس شاہ کی زندگی کا ماہ، جس کی روشنی مدھم پڑ چکی تھی، مغرب کی فنا میں غروب ہو گیا۔[۸۵]

حسن سجزی کے مذکورہ بیان سے صاف ظاہر ہے کہ شہزادہ محمد نے میدانِ جنگ تک کا فاصلہ دوپہر کے درمیان طے کیا اور دریائے راوی کے کنارے باغ نیر کے قریب یہ معرکہ ہوا۔ دوپہر سے شام تک جاری رہنے والے اس معرکے میں شہزادہ محمد کی شہادت ہوئی اور یہ سب کچھ ایک ہی دن میں ہوا جب کہ خسرو نے اس حوالے سے اگلے روز یعنی ۶۸۴ھ کی پہلی تاریخ درج کی ہے۔ خسرو اور حسن سجزی کے ہاں یہ اختلاف کیوں پایا جاتا ہے اس کی وضاحت خسرو کے واقعۂ اسیری کے بیان میں کی جائے گی۔ یہاں ایک اور غلط فہمی کو دور کرنا ضروری ہے جو منتخب التواریخ کے مترجم محمود احمد فاروقی کو ہوئی۔ مذکورہ مترجم نے حسن سجزی کے مرثیے کی بابت لکھا کہ ''ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ یہ نثری مرثیہ امیر خسرو نے لکھا تھا۔ فرشتہ نے بھی اس کی تائید کی اور لکھا کہ... اس (خسرو) نے یہ نثری مرثیہ لکھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ منتخب التواریخ کے کاتب نے غلطی سے میر حسن کا نام لکھ دیا ہے ورنہ ملّا بدایونی سے ایسی فاش غلطی سرزد نہیں ہو سکتی۔[۸۶] راقم نے جب اس حوالے سے برنی کی تاریخ فیروز شاہی کا مطالعہ کیا تو اس کی نظر سے ایسا کوئی جملہ نہیں گزرا۔ برنی نے تو اس واقعے کو نہایت مختصر بیان کیا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے حسن سجزی کے مرثیے کا ذکر تک نہیں کیا، البتہ برنی نے امیر خسرو کے حوالے سے بڑے واضح طور پر لکھا کہ ''انھوں (خسرو) نے خان شہید کے دو مرثیے نظم میں کہے جن میں جادو کیا ہے۔''[۸۷] اس کے علاوہ تاریخ فرشتہ میں بھی اس واقعے کے بیان میں کہیں بھی امیر خسرو اور حسن سجزی کے ان مرثیوں کا تذکرہ موجود نہیں۔[۸۸]

حقیقت یہ ہے کہ میر حسن سجزی کا نام درج کرتے ہوئے نہ تو کاتب سے غلطی ہوئی اور نہ ہی ملّا عبد القادر سے سہو ہوا۔ یہ نثری مرثیہ حسن سجزی ہی کا تحریر کردہ تھا۔ معاصر تاریخ سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے۔ اس حوالے سے سب سے بڑی دلیل تو یہ ہے کہ ملّا عبد القادر بدایونی اور اسلامی ہند کی عمومی تاریخ لکھنے والے اکثر مؤرّخین کے پیش رو تاریخ مبارک شاہی کے مصنف یحییٰ بن احمد سرہندی ہیں۔ منتخب

التواریخ میں سبب تالیف کتاب کے عنوان سے ابتدائیہ لکھتے ہوئے خود ملا عبد القادر بدایونی اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''تاریخ مبارک شاہی اور نظام التواریخ نظامی دونوں کو میں نے اپنے پیش نظر رکھا۔''(۸۹) منتخب التواریخ کی تالیف ملّا عبد القادر نے ۹۹۹ تا ۱۰۰۴ھ کے دوران کی۔ اس کا اختتامیہ لکھتے ہوئے انھوں نے خود کہا کہ ''میں نے ۲۳/ ماہ جمادی الثانی ۱۰۰۴ھ کو اپنے رہوار قلم کی باگیں کھینچ لیں اور جتنا کچھ لکھا گیا، اس پر اکتفا کرلیا۔''(۹۰) جب کہ تاریخ مبارک شاہی ۸۳۸ھ کے لگ بھگ تصنیف کر کے خان دان سادات کے مشہور فرماں رواں معز الدین ابو الفتح مبارک شاہ بن خضر خان ۸۲۴ھ۔ ۸۳۷ کے نام نامی سے معنون کی گئی۔''(۹۱) منتخب التواریخ سے تقریباً ۱۶۶ برس قبل لکھی گئی اس تاریخ میں بھی امیر حسن دہلوی کے اس مرثیے کا مکمل متن پیش کیا گیا ہے۔ اس بابت یحییٰ بن احمد سرہندی کا بیان ہے کہ:

> ان سطور میں ملا عین کے آنے اور ''خانِ بزرگ'' (شہزادہ محمد شہید) کے شہادت پانے کی کیفیت من وعن اسی طرح بیان کی جاتی ہے جس طرح افصیح المتکلمین، امیر حسن علاء سجزی، علیہ الرحمتہ، نے اس کے مرثیے میں بیان کی ہے۔(۹۲)

محمد سعید مارہروی(۹۳) اور ڈاکٹر وحید مرزا نے صرف بدایونی کا حوالہ دے کر کہا کہ خواجہ حسن دہلوی کا منشور مرثیہ اس نے منتخب التواریخ میں نقل کیا ہے۔(۹۴) جب کہ درست صورت حال یہ ہے کہ اس کتاب سے ۱۶۶ برس قبل ہی یحییٰ بن احمد سرہندی نے اپنی تصنیف تاریخ مبارک شاہی میں مکمل مرثیہ فارسی میں درج کیا۔(۹۵) اور بعد کے مؤرخین نے وہیں سے نقل کیا ہے۔

حسن سجزی کے حوالے سے مذکورہ بالا مباحث سے قطع نظر خود سجزی کے بیان سے شبہ ہوتا ہے کہ وہ اس معرکے میں شہزادہ محمد شہید کے ساتھ موجود نہیں تھے۔ اسی لیے مسعود علی محوی، شبلی کی پیروی میں یہ بات کہنے کے باوجود کہ خسرو کے ساتھ حسن سجزی کو بھی گرفتار کرلیا گیا تھا، شکوک وشبہات کا شکار نظر آتے ہیں۔ وہ خود اس بارے میں کہتے ہیں کہ:

> امیر حسن کے متعلق اب تک ہمیں ایسا کوئی مواد نہیں ملا جس کی بنا پر ہم کہہ سکیں کہ وہ بھی قطعاً شریکِ معرکہ اور گرفتاری اور قید میں امیر خسرو کے ساتھ تھے۔(۹۶)

سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ اعتراف ایک ایسے شخص کا ہے جس نے بڑی محنت سے کلیات حسن سجزی مرتب کی۔ اس کی ابتدا میں ۱۱۴ صفحات کا دیباچہ لکھا جس میں حسن سجزی کے حیات اور کارناموں کا تحقیقی

جائزہ کیا گیا ہے۔ اس کے بعد ۶۲۳ صفحات پر مشتمل ان کا فارسی کلام درج ہے۔ انھوں نے حسن سجزی کی کلیات مرتب کرتے ہوئے ان کے ایک ایک شعر کے سن پر غور کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ تمام معاصر تذکروں اور تواریخ کو کھنگالا لیکن آخر میں اس بات کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوئے کہ حسن سجزی کے کلام میں کہیں بھی اس واقعے کی طرف اشارہ نہیں پایا جاتا۔[۹۷] بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شاعر جس کے کلام کا اتنا بڑا ذخیرہ محفوظ ہو اور اس میں ہزاروں کی تعداد میں اشعار ہوں وہ شاعر کسی سانحے سے دو چار ہو اور اسے نظم نہ کرے۔ یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ حسن سجزی کی مشہور تالیف فوائد فواد میں ایک عالمانہ ''مقدمہ'' لکھتے ہوئے پروفیسر نثار احمد فاروقی نے سوائے اس کے کہ ''امیر خسرو نے نظم میں اور امیر حسن نے نثر میں مرثیہ لکھا۔''[۹۸] کوئی اور وضاحت نہیں کی۔

اس بارے میں ایک مضبوط دلیل یہ ہے کہ بعد کے تذکرہ نویس اور مؤرّخین اس حوالے سے جس قسم کے مخمصے کا شکار نظر آتے ہیں، اس کی وجہ محض حسن سجزی کا منثور مرثیہ ہے۔ جب کہ اس مرثیے میں کہیں بھی ایسے شواہد نہیں ملتے کہ وہ خود اس معرکے میں موجود تھے۔

یہ وہ شواہد ہیں جن کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ حسن سجزی غالباً خود اس معرکے میں شریک نہیں تھے لہٰذا ممتاز حسین کا یہ کہنا درست معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اس واقعے کے عینی شاہد تھے۔ بلکہ شواہد یہ بتاتے ہیں کہ انھوں نے یہ مرثیہ معرکے میں شریک عینی شاہدین سے سن کر قلم بند کیا ہوگا۔ اس بات کی وضاحت کے لیے ضروری ہے کہ مرثیے کے بعض حصوں کا گہرائی سے جائزہ لیا جائے۔ سجزی نے اس مرثیے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ:

...تمر ملعون با تمامیٔ لشکر بسنہ فرسنگی فرود آمدہ است۔[۹۹]

سیدہ ملیحہ کاظمی نے سہواً اسے ایک فرسنگ سمجھا۔[۱۰۰] فرسنگ یا فرسخ سے مراد تین میل کی مسافت ہے۔ اہل فارس ۴۰۰۰ گز کی مسافت کو ایک میل جب کہ زمانۂ حال میں انگریزوں کے ہاں ۱۷۶۰ گز کی مسافت کو ایک میل مانا جاتا ہے۔[۱۰۱] سجزی نے اسی مرثیے میں جنگ کا مرکز آبِ لاہور بھی قرار دیا ہے۔[۱۰۲] تاریخ مبارک شاہی کے مؤلف نے بھی لکھا کہ ''دریاے لاہور کے کنارے باغ نیر میں ملعونوں کے ساتھ جنگ ہوئی۔[۱۰۳] ملّا عبدالقادر نے بھی آبِ لاہور اور راوی کو ہی میدانِ جنگ ٹھہرایا ہے۔[۱۰۴] برنی نے اس بابت لکھا کہ:

... درمیان لوہور و دیوبالپور با تمر ملعون کہ سکی سگرف از سگان چنگیز خانی بود محاربہ و مقابلہ افتاد۔[۱۰۵]

بعد کے بیشتر مؤرّخین اس بات پر متفق ہیں کہ یہ معرکہ راوی کے کنارے اور دیپال پور سے کچھ فاصلے پر پیش آیا۔ حسن سجزی کے تین فرسنگ والے بیان کو ذہن میں رکھتے ہوئے دریائے راوی اور دیپال پور کی جغرافیائی صورتِ حال اور فاصلے کے بارے میں کچھ وضاحت یہاں ضروری ہے۔ راوی پنجاب کا مشہور دریا، جو کانگڑہ کے پہاڑوں سے نکل کر شمال مغربی جانب بہتا ہوا گورداس پور کے ضلعے میں پہاڑی علاقے سے میدانی علاقوں میں آتا ہے۔ پھر لاہور کے قریب سے گزرتا ہوا چناب و جہلم میں شامل ہو جاتا ہے۔ جب کہ دیپال پور ضلع اوکاڑہ کا قدیمی شہر ہے۔ یہ وہی شہر ہے جہاں سلطان التمش نے تاتاریوں کی یورش کو روکنے کے لیے ایک بڑی فوجی قائم کی جو بعد میں ایک صدی تک قائم رہی۔[۱۰۶]

ملتان سے دیپال پور کا فاصلہ تقریباً سوا دوسو کلومیٹر سے بھی زیادہ کا ہے جب کہ دیپال پور سے راوی کا فاصلہ بھی تقریباً دوسو کلومیٹر ہے۔[۱۰۷] سجزی کے ''تین فرسنگ'' والے بیان کو اگر درست مان لیا جائے تو یہ ملتان سے مذکورہ معرکے کا فاصلہ پندرہ بیس کلومیٹر سے زیادہ نہیں بنتا۔ خود سجزی کے اس جملے سے جس میں انھوں نے لکھا ہے کہ:

> ... و بہ یک فرسنگی آن ملاعین پیش باز آمد۔ موضع مصارف در حدود باغ نیّر بر راست کہ سوارۂ چرخ در ولایت نیم روز رسید۔[۱۰۸]

اس جملے سے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ فاصلہ تین فرسنگ سے بہت زیادہ تھا۔ اسی لیے شہزادہ محمد شہید فجر کے وقت روانہ ہوئے اور دوپہر کے قریب معرکۂ جنگ کے مقام تک پہنچے۔ وہیں شام کے وقت ان کی شہادت ہوئی۔ اگر یہ فاصلہ تین فرسنگ ہی ہوتا تو بمشکل ایک سے دو گھنٹے میں یہ فاصلہ طے ہو جاتا۔

اس کے علاوہ ضیاء الدین برنی کی تاریخ فیروز شاہی بھی اس واقعے کو سمجھنے کا اہم ذریعہ ہے۔ یہ تصنیف امیر کے انتقال کے ۳۱ ویں برس (۱۳۵۶ء) کو مکمل ہوئی۔ برنی ایک صاحب حیثیت مؤرخ تھے۔ انھوں نے اپنے پیش رو مؤرخین مثلاً قاضی منہاج وغیرہ کے پُر پیچ طرزِ تحریر سے ہٹ کر سادہ واقعہ نگاری کی زبان اپنائی اور ہر واقعہ لکھنے سے پہلے خوب چھان بین کی۔ واقعے اور تاثر کو پیش کرنے میں وہ ایک طرح سے ابنِ خلدون کا پیش رو ہے۔[۱۰۹] سب سے بڑھ کر یہ کہ سات صدی سے زائد کا عرصہ گزرنے کے باوجود آج تک مجموعی طور پر:

> برنی کی کتاب کو ہر دور کے مؤرخ نے مستند اور قابلِ اعتبار سمجھا۔ جس عہد کی تاریخ اس میں لکھی گئی ہے، اس پر اسی کو سب سے اوّل اور سب سے معتبر ماخذ

قرار دیا ہے۔[۱۱۰]

ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ امیر خسرو، حسن سجزی اور ضیاء الدین برنی کے گہرے دوستانہ مراسم رہے ہیں۔ خود برنی نے حسن سجزی کے بیان میں اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> سالہا مرا با امیر خسرو و امیر حسن مذکو تو دد و یگانگی بودہ است و نہ ایشاں بی صحتِ من بتو انستندی بود نہ من تو انستمی کہ مجالست ایشاں را گذرانم و از صحبتِ من میانِ ایشاں ہر دو او ستاد قرابتی شدو در خانہائی یکدیگر امد و شد کردن گرفتند۔[۱۱۱]

اس سانحے سے بلبن حکومت کو زبردست صدمہ پہنچا۔ ضیاء الدین برنی اس منظر کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کے بعد ''ملتان میں عام مصیبت کی وجہ سے ہر گھر تعزیت کا گھر بن گیا اور سوگ میں لوگوں نے سیاہ کپڑے پہن لیے۔ نوحہ کرنے والوں کا شور آسمان تک پہنچا۔''[۱۱۳]

شہزادہ محمد کی شہادت کی خبر غیاث الدین بلبن کو پہنچانا ایک مشکل ترین مرحلہ تھا۔ اتنے بڑے سانحے کی بابت زبان کھولنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ فتوح السلاطین کے مصنف عصامی کا بیان ہے کہ جس خط کے ذریعے اس سانحے کا پیغام بھیجا گیا تھا، سلطان کے سامنے اسے پڑھنے کی ہمت نہ پا کر یہ طریقہ اختیار کیا گیا کہ اس خط کو سلطان بلبن کے جوتے میں رکھ دیا گیا تا کہ جب بلبن اس جوتے کو پہنے تو اس خط کو دیکھ لے۔ عصامی لکھتا ہے کہ:

ہم آخر شنیدم پس از چند گاہ — نہادند آں نامہ در کفشِ شاہ
مؤذّن چو زد نعرۂ سو بہ سو — شہ از تخت برخاست بہرِ وضو
بہ کفش اندروں پائے خودمی کشید — یکے نامہ افتادہ در کفش دید
سرِ نامہ چوں دید خسرو سیاہ — بزد نعرہ و بر زمیں زد کلاہ[۱۱۴]

اس خبر سے بلبن پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ایک اسّی سالہ بوڑھے کے لیے یہ سانحہ ناقابلِ برداشت تھا۔ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر خلوت میں زار زار روتا اور آہ و فریاد کرتا۔[۱۱۵] اسی کیفیت میں ۶۸۶ھ میں اس کی وفات ہوئی۔[۱۱۶] اس سانحے کی شدت کا اندازہ امیر خسرو کے ان جملوں سے لگایا جاسکتا ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ لڑائی کے دوران ''شہیدوں کے لہو سے زمین سرخ ہوگئی اور پانی کی مانند ان کا خون زمین میں جذب ہوتا رہا۔''[۱۱۷] یہ سانحہ عہدِ بلبن میں تاریخ کا سب سے بڑا المیہ ہے۔ اگر شہزادہ محمد کو تختِ بلبن پر بیٹھنے کا موقع ملا ہوتا تو ہندوستانی ادب و ثقافت کی تاریخ دوسرے ہی انداز میں لکھی جاتی۔[۱۱۸]

اس سانحے میں امیر خسرو کی گرفتاری مسلّم ہے۔ تاریخ فیروز شاہی سے لے کر آج تک لکھی جانے والی تمام تواریخ اور خسرو کے سوانح نگاروں نے اس گرفتاری پر کسی قسم کے شکوک وشبہات کا اظہار نہیں کیا۔ حیرت ہے کہ مشاہیر نے اس گرفتاری کے حوالے سے مبالغہ آمیز واقعات لکھتے ہوئے محتاط رویہ اختیار نہیں کیا۔ یہاں تک کہ سید ہاشمی فرید آبادی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ:

> امیر خسرو اس معرکے میں مغلوں کے ہاتھوں اسیر ہوئے (فرشتہ وغیرہ) غالباً قیاسی ہے اگرچہ ان کی گرفتاری اور کوئی دو برس تک بلخ میں قید رہ کر رہا ہونا مثنوی 'خضر خاں دول رانی' اور ان کے دوسرے اشعار واقوال سے ثابت ہے۔[۱۱۹]

عبارت میں ہاشمی فرید آبادی عجیب مخمصے کا شکار نظر آتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ امیر خسرو کی اسیری کے واقعے کو قیاسی قرار دے کر اس کو ماننے ہی سے انکاری ہیں اور دوسری طرف یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ خسرو کی مثنوی 'خضر خاں دول رانی' اور دیگر اشعار سے ان کی گرفتاری اور دو برس بلخ میں قید ہونا ثابت ہے۔

اقتباس میں درج ہاشمی فرید آبادی کی ہر بات تاریخی حقائق کے خلاف ہے کیوں کہ خسرو کی گرفتاری تو خود اس عہد میں لکھی گئی تاریخ فیروز شاہی سے ثابت ہے جس میں برنی لکھتے ہیں کہ:

> اس جنگ میں خسرو مغلوں کے ہاتھوں قید ہوئے، لیکن کسی صورت سے ان سے رہائی پالی۔[۱۲۰]

جب کہ خسرو کی رہائی کے حوالے سے مثنوی 'خضر خاں دول رانی' کا حوالہ دے کر بلخ میں دو برس کی قید کے واقعے کا بیان بھی سراسر مبالغہ آرائی کے سوا کچھ نہیں۔ ہاشمی فرید آبادی خسرو کے واقعۂ اسیری کے حوالے سے خلطِ مبحث کا شکار نظر آتے ہیں۔ انھوں نے مذکورہ مثنوی کا مطالعہ کیے بغیر بلخ میں دو برس کی قید کو اس مثنوی سے نتھی کرنے کی کوشش کی جو سراسر غلط ہے۔ انھیں یہ غلط فہمی غالباً فرشتہ کے اس بیان سے ہوئی جس میں وہ کہتا ہے کہ ''ان (خسرو) کی رہائی کا وہی قصّہ ہے جو خود حضرت خسرو اپنی تصانیف خضر خانی اور دیولدی [کذا: دیول رانی] وغیرہ میں تحریر کیا ہے۔''[۱۲۱]

حقیقت یہ ہے کہ اس مثنوی میں خسرو نے اس سانحے کے بعد اپنی گرفتاری اور اس دوران ہونے والی تکالیف اور رہائی کا ذکر تو کیا ہے لیکن بلخ لے جا کر دو برس کی قید کا کوئی اشارہ اس مثنوی میں نہیں ملتا۔[۱۲۲] شیخ محمد اکرام بھی اس بابت اپنی شکست کا اعتراف کرتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ خسرو نے ''پتا نہیں اس بلا سے کس طرح رہائی پائی۔''[۱۲۳] حسن برنی بھی مبہم انداز میں یہی لکھ کہ گرفتاری کے بعد ''خوش قسمتی سے کسی

طرح چھوٹ کر آ گئے۔''[۱۲۴] زینت ساجدہ نے تو مزید ایک قدم آگے جا کر یہ تک لکھ دیا کہ:

> جب سب لوگوں کو رہائی ملی تب بھی خسرو کو نہ مل سکی کیوں کہ ان کی شہرت دشمنوں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ جب معلوم ہوا یہی خسرو ہیں تو انھیں روک لیا گیا اور بدلے میں مال غنیمت چھوڑ دیا اور تاوان معاف کیا گیا۔ دو سال تک یہ وہیں رہے۔[۱۲۵]

اس صورتِ حال میں مسعود علی محوی کا یہ کہنا کہ دو سال کے بعد مغلوں کی قید سے رہا ہو کر دہلی پہنچنا مسلّم ہے۔[۱۲۶] کسی طور پر بھی ثابت نہیں۔ مذکورہ بالا تمام اقتباسات کے جائزے کے بعد ایک اہم سوال جو ہمارے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے، وہ یہ کہ آخر اردو والوں کے پاس خسرو کے حوالے سے بلخ اور دو برس قید کی روایت آئی کہاں سے؟ اس بارے میں سب سے اہم حوالہ شبلی کا ہے۔ ان کا بیان ہے کہ'' تاتاری ان کو گرفتار کر کے بلخ لے گئے... دو برس بعد امیر نے کسی طرح تاتاریوں کے ہاتھ سے رہائی پائی۔''[۱۲۷] بعد کے لکھنے والوں نے اس روایت کو شبلی سے نقل کر کے دہرایا۔ نہ صرف دہرایا بلکہ مسعود محوی نے تو پیروئ شبلی میں اس بات کو مسلّم بھی مان لیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شبلی نے یہ روایت کہاں سے نقل کی۔ اس سلسلے میں بلخ والی بات کو شبلی نے بدایونی سے منسوب کرنے کی کوشش کی ہے جو کہ درست نہیں۔ انھوں نے شعر العجم حصہ دوم کے حواشی میں اس کی وضاحت میں حوالہ دیتے ہوئے ''بدایونی ص ۱۳۱''[۱۲۸] تو درج کیا لیکن یہ کہیں نہیں لکھا کہ یہ کون سا نسخہ تھا یا کس ایڈیشن سے شبلی نے استفادہ کیا۔ راقم نے اس حوالے سے کوشش کی تو ۱۸۶۸ء میں ایشیاٹک سوسائٹی، کلکتہ سے شائع ہونے والی منتخب التواریخ کے صفحہ نمبر ۱۳۱ میں اس واقعے کی تفصیل تو ملی اور درست سن اور تاریخ کی بھی تصدیق ہوئی لیکن کہیں بھی بلخ یا دو سال کی قید کے حوالے سے تفصیلات نہیں ملیں۔[۱۲۹] البتہ اس کتاب کے اگلے صفحات میں خسرو کے حوالے سے یہ ضرور درج ہے کہ:

> امیر خسرو نیز دران روز در بند لاہوری نوکر مغول افتادہ بود و بار توبرہ بر سر داشت و ازاں حالت یاد میدہد و میگوید منکہ بر سر نمی نہادم گل بار بر سر نہاد و گفتا جُل و در مرثیہ ترکیب بند کہ در دیوان غرۃ الکمال مسطور است۔[۱۳۰]

اس اقتباس میں کہیں بھی بلخ اور دو سال قید کی وضاحت نہیں ہوتی۔ اس سلسلے میں ایک اور بات سمجھ لینا ضروری ہے کہ کیا شبلی وہ پہلے محقق ہیں جن سے یہ سہو ہوا یا اردو میں یہ روایت اس سے قبل بھی کہیں ملتی ہے؟ اس بابت ڈاکٹر وحید مرزا کا بیان ہے کہ:

شبلی نعمانی کا یہ بیان جو غالباً انھوں نے احمد سعید مارہروی کی کتاب حیاتِ خسرو سے اخذ کیا ہے، کسی طرح صحیح نہیں ہوسکتا کہ مغل خسرو کو قید کر کے بلخ لے گئے تھے اور وہاں سے دو سال کے عرصے کے بعد وہ ملتان واپس آئے۔[۱۳۱]

یہ بات درست ہے کہ شبلی نے شعر العجم کا اختتام (۸۔ ۱۹۰۷ء) ۱۳۲۵ھ میں کیا[۱۳۲] اور اس کتاب کی اشاعت سے ۴ برس قبل (۱۹۰۳ء) ۱۳۲۱ھ کو احمد سعید مارہروی کی تصنیف حیاتِ خسرو شائع ہوچکی تھی۔[۱۳۳] اپنی اس تصنیف میں احمد سعید مارہروی نے بڑے واضح انداز سے لکھا کہ ''امیر خسرو کو قید کر کے بلخ لے گئے جہاں دو برس کے بعد نہایت مشکل سے رہائی ملی۔''[۱۳۴] اس عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ روایت شبلی سے قبل احمد سعید مارہروی نے درج کی۔ غالباً شبلی کے پیشِ نظر احمد سعید مارہروی کی کتاب حیاتِ خسرو ضرور رہی ہوگی اور غالب امکان یہی ہے کہ انھوں نے یہ روایت مذکورہ تصنیف سے ہی لی ہو لیکن شبلی جیسے بلند پایا محقق نے نسبتاً غیر معروف احمد سعید مارہروی کا حوالہ دینے سے گریز کیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ احمد سعید مارہروی نے یہ روایت کہاں سے نقل کی؟ ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اس بابت لکھا کہ ''انھوں (شبلی اور احمد سعید مارہروی) نے اس کی کوئی سند فراہم نہیں کی۔''[۱۳۵] یہ بات درست ہے کہ احمد سعید مارہروی نے اپنی تصنیف میں اس بابت کوئی حوالہ درج نہیں کیا لیکن شبلی کے حوالے سے وضاحت ہوچکی ہے کہ انھوں نے سہواً غلط حوالہ درج کیا۔ یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ڈاکٹر وحید مرزا اور ڈاکٹر معین الدین عقیل نے بھی خسرو کے واقعہ اسیری کی بحث کے دوران یہ نہیں بتایا کہ آخر احمد سعید مارہروی نے دو برس قید اور بلخ والی روایت کہاں سے لے کر درج کی۔ ماضی میں حواشی اور حوالے نہ ڈالنے کی روایت کی وجہ سے اس بات کی تہ تک پہنچنا خاصا دشوار طلب کام تھا۔ راقم نے جب فارسی مآخذ اور متون کو کھنگالنا شروع کیا تو اس روایت کی تلاش میں بڑی دقت پیش آئی۔ بالآخر پیش رفت ہوئی اور عالم گیر کے زمانے کے مشہور مؤرّخ سجان رائے بھنڈاری، جن کا انتقال ۱۱۰۷ھ مطابق ۱۶۹۵ء میں ہوا تھا،[۱۳۶] نے اپنی مشہور تصنیف خلاصۃ التواریخ جو اورنگ زیب کے ۴۰ جلوس میں لکھی گئی تھی،[۱۳۷] میں امیر خسرو کے واقعۂ اسیری کی بابت لکھا کہ ''اکمل الشعرا امیر خسرو دہلوی کے ہمراہ شاہزادہ بود بہ دست مغول اسیر گردید و در بلخ رفتہ از انجا نجات یافتہ باز بہندوستان آمد۔''[۱۳۸] اس اقتباس میں بھی بلخ لے جانے کا بیان تو موجود ہے لیکن دو برس کی قید کا کہیں ذکر نہیں، لہٰذا راقم نے تلاش کا سلسلہ جاری رکھا۔ بہت سے فارسی مآخذ کو دیکھنے کے بعد بالآخر یہ تلاش نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور فارسی کی مشہور تصنیف خزانۂ عامرہ کا مطالعہ کرتے

ہوئے راقم کی نظر سے بلگرامی کا یہ جملہ گزرا کہ:

سلطان محمد را شہید ساختند و امیر خسرو را اسیر کردہ ببلخ بردند بعد دو سال رہائے یافتہ بخدمت سلطان بلبن آمد و قصیدۂ کہ در مرثیہ خان شہید گفتہ بود۔[۱۳۹]

بلگرامی کے ان جملوں کے بعد اس بات میں شبہ کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ احمد سعید مارہروی نے خسرو کی دو برس قید اور بلخ کی روایت کو بعینہٖ خزانۂ عامرہ سے ترجمہ کیا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے خزانۂ عامرہ ڈاکٹر ایوب قادری کے مطابق ۱۱۷۱ھ[۱۴۰] اور شمس بریلوی کے مطابق ۱۱۷۶ھ کی تالیف ہے۔ اس سن کو شمس بریلوی نے درست نہیں مانا۔[۱۴۱] لیکن درست سن کا تعین بھی نہیں کیا۔ غالباً ڈاکٹر ایوب قادری کا بتایا ہوا سن ہی درست ہے۔ بلگرامی کا انتقال ۱۷۸۶ء میں ہوا[۱۴۲] جب کہ اس سے ۹۱ برس قبل سجان رائے بھنڈاری اس دنیا سے کوچ کر چکے تھے۔ اس لحاظ سے قدیم ماخذ تو خلاصتہ التواریخ ہی ہے لیکن اس میں خسرو کو بلخ لے جانے کا بیان موجود ہے جب کہ خزانۂ عامرہ میں بلخ اور دو برس کی قید، دونوں بیانات موجود ہیں لہٰذا یہ بات حتمی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ احمد سعید مارہروی کے پیشِ نظر اس حوالے سے خزانۂ عامرہ رہی ہوگی، خلاصتہ التواریخ ہرگز نہیں۔ ظاہر سی بات ہے یہ سارے مآخذ گیارھویں اور بارھویں صدی ہجری کے ہیں جن پر یقین کرنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی جب کہ اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ خسرو کے ہاں ایسا کوئی بیان نہیں ملتا اور نہ ہی معاصر تاریخ سے ایسے شواہد ملتے ہیں جن سے آزاد بلگرامی یا سجان رائے بھنڈاری کے ان بیانات کی تائید ہوتی ہو۔ بلخ کی روایت کے خلاف منشی افتخار عالم مارہروی نے مولانا عبدالماجد دریابادی کے نام اپنے خط میں لکھا کہ امیر خسرو کو قید کر کے تبریز لے جایا گیا اور شہادت کے طور پر یہ شعر لکھا ہے:

خسرو خستہ کہ ماندہ ست بہ تبریز اسیر
آہ اگر زو خبرے سوئِ خراساں نرود[۱۴۳]

حالاں کہ اکثر و بیش تر نسخوں میں ''بہ تبریز اسیر'' کی بجائے ''بدہلی در بند'' تحریر ہے، لہٰذا اس شعر کو سند قرار دینا قرین قیاس نہیں ہے۔[۱۴۴] جہاں تک دو برس کی قید کا تعلق ہے، ڈاکٹر معین الدین عقیل نے شبلی اور احمد سعید مارہروی کے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ ''یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی۔''[۱۴۵] ڈاکٹر وحید مرزا کا بھی یہی کہنا ہے کہ ان کے کچھ اشعار سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ ملتان سے کچھ زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ قسمت نے ان کی گلو خلاصی کر دی۔[۱۴۶] ان کے کلام کے مطالعے سے اس بات کا کہیں اشارہ تو نہیں ملتا کہ انھیں دو برس قید یا بلخ لے جایا گیا بلکہ بعض ایسے شواہد ضرور ملتے ہیں جس سے اس بیان کی تردید ہوتی ہے۔ مثلاً

خسرو نے اپنے مرثیے میں ایک جگہ لکھا کہ:

کنون کہ شش صد و ھشتاد و چار شد تاریخ مرا ایسی و سہ آید نوید سی و چہار
نہ سی و چار کہ گرسی ہزار سال بود چو در حساب فنا شد نہ سی شمر نہ ہزار[۱۴۷]

ان اشعار کو پڑھ کر صاف پتا چلتا ہے کہ یہ مرثیہ انھوں نے اپنی رہائی کے فوراً بعد ۶۸۴ھ میں لکھا۔ اس میں وہ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ:

نماند ہیچ کس از دوستاں پار امسال[۱۴۸]

گزشتہ سال کے دوستوں میں اس سال کوئی باقی نہیں رہا۔ اس سال یعنی ۶۸۴ھ کو میری عمر ۳۴ برس کی ہوگئی مگر اس سے کیا حاصل اگر میری عمر بجائے تیس اور چار کے تیس ہزار بھی ہوجائے تو بھی میرا انجام فنا ہے۔

اس شعر سے صاف ظاہر ہے کہ خسرو اس واقعے کے اگلے ہی سال ملتان میں موجود تھے اور دوستوں سے بچھڑنے پر نوحہ کناں تھے۔ بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ اس قصیدے میں ایک شعر ایسا بھی ہے جس سے گمان ہوتا ہے کہ خسرو اپنی اسیری کے اگلے ہی روز رہا ہوگئے تھے۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

جمعہ بود و سلخ ذی حجہ کہ بود آں کار زار
آخر ہشتاد و سہ آغاز ہشتاد و چہار[۱۴۹]

خسرو نے یہاں شعر میں غالباً اس سانحے کے رونما ہونے کی تاریخ ۶۸۳ھ کا آخری دن قرار دیا جب کہ ۶۸۴ھ کے روزِ اوّل کو اس جنگ کے خاتمے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جب کہ حسن سجزی نے اپنے مرثیے میں واضح طور پر لکھا کہ جب شہزادہ محمد کو معلوم ہوا کہ تمر ملعون اپنے تمام لاؤلشکر سمیت تین فرسنگ کے فاصلے پر خیمہ زن ہے تو وہ ۶۸۳ھ کے ماہ ذی الحجہ کی آخری تاریخ کو جمعے کے روز صبح ہوتے ہی اس طرف روانہ ہوئے۔ اسی مرثیے کے آخر میں تمام واقعات کی تفصیل بیان کرنے کے بعد انھوں نے لکھا کہ ٹھیک غروب آفتاب کے وقت اس شاہ کی زندگی کا ماہ، جس کی روشنی مدھم پڑ چکی تھی، مغربِ فنا میں غروب ہوگیا۔[۱۵۰] ممتاز حسین نے لکھا کہ ''ممکن ہے کہ خسرو جنگ کرتے ہوئے سلطان محمد کے شہید ہونے سے پہلے ہی گرفتار ہوگئے ہوں۔''[۱۵۱] لیکن یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی کیوں کہ مؤرّخین کا بیان ہے کہ شہزادے کی شہادت سے قبل ہندوستانی فوج نے مغلوں کے بڑے بڑے سور ما مار گرائے تھے لیکن قسمت کی خرابی سے شہزادے کے تیر لگا اور اس کی موت واقع ہوگئی تو فوج میں بھگدڑ مچی ہوگی اور اسی بھگدڑ کے دوران خسرو کو گرفتار کیا گیا ہوگا۔

بعد میں ملتان میں کیا ہوا خسرو اس سے بے خبر رہے ہوں گے لیکن سجزی چوں کہ گرفتار نہیں ہوئے تھے لہٰذا انھیں اس صورت حال اور شہزادے کی موت کے صحیح وقت کا ضرور پتا ہوگا جب ہی ان دونوں کے بیان کردہ تاریخ میں ایک دن کا اختلاف پایا جاتا ہے۔ مولوی ذکاء اللہ نے اس بابت لکھا کہ نماز ظہر کی ادائی کے بعد مغل سے ہونے والی ایک جھڑپ میں ایک تیر ایسا لگا کہ شہزادہ محمد کا خاتمہ ہوگیا۔[۱۵۲] ظاہر سی بات ہے یہ جھڑپ دیر تک جاری رہی ہوگی اور غروب آفتاب کے وقت ہی شہزادہ محمد کی شہادت ہوئی ہوگی۔ یہ سب کچھ اسی روز ہوا یعنی ۶۸۳ھ کے آخری روز لیکن خسرو کا ۶۸۴ھ کے پہلے روز کے حوالے سے جو بیان ہے وہ غالباً اس لیے ہے کہ انھیں اس گرفتاری کے بعد اگلے روز بھاگنے کا موقع ملا ہوگا اور خسرو نے اس مصیبت سے اپنی رہائی کی تاریخ ۶۸۴ھ کے روز اوّل کو شہزادہ محمد کی شہادت کے سانحے سے جوڑ کر اس واقعے کے اختتام کو اگلے روز سے نتھی کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس بات کی حمایت میں ایک دلیل یہ بھی ہے کہ فتوح السلاطین کے مصنف نے اس واقعے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے آخر میں لکھا کہ شہزادے کی نعش مغلوں سے زر کثیر دے کر حاصل کی گئی۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

پس از گریہ و شور و آہ و نفیر　　کہ ہر چار در ماتم است ناگزیر
شنیدم براں زمرۂ بدشگال؟　　ز اقطاع خود بس فرستادہ مال
زرے داد آں رائے اختر سعید　　تنِ جاں ز دستِ مغل وا خرید[۱۵۳]

خسرو نے مرثیے میں ان باتوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ غالباً اس کے بیان سے خاندان بلبن کی ہتک کا پہلو نکلتا ہو اس لیے خسرو نے اس کو بتانے سے اجتناب کیا لیکن غالب امکان یہی ہے کہ ان تمام معاملات سے خسرو ضرور آگاہ رہے ہوں گے۔

خسرو نے خود اپنی مثنوی دول رانی خضر خاں کے بعض اشعار میں اپنی اسیری کے واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کے قصیدے حکم الحکم (وسط الحیات) اور مثنوی دول رانی خضر خاں دونوں کو ملا کر پڑھنے سے اس سانحے کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔ مثنوی دول رانی خضر خاں میں وہ کہتے ہیں کہ:

در ایامی کہ ایں نفسِ بد آموز　　گرفتارِ مغل شد دور از امروز
بیاباں می دویدم ریگ بر ریگ　　ز بس گرما سرم جوشید چوں دیگ

من و بامن چو من تشنہ سوارے رسیدیم از رہ اندر جوے بارے
من از چہ نفط جانم بود در تاب ندادم نفط خود را روغن از آب
بی تر کردم و تر شد جگرہم سکونت یافت لختے جانِ درہم
فتاد آں تشنہ و زاں تشنہ تر رخش کہ بخشِ جاں برو زآں آب جاں بخش
ہم او سیراب شد و ہم مرکبش سیر نشد دردانِ جاں ہر دو را دیر[۱۵۴]

خسرو کے اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ جس وقت مغلوں کے ہاتھوں اسیر ہوئے تو انھیں ایک ویران ریگستان میں چلنا پڑا۔ گرمی اس قدر شدید تھی کہ جس کی شدت سے ان کا سر دیگ کی طرح پک رہا تھا۔ سفر کے دوران وہ اور ان کا ساتھی مغل جو انھیں قید کر کے لیے جا رہا تھا، شدید پیاس کے عالم میں ایک چشمے پر پہنچے۔ خسرو نے پیاس بجھانے میں بڑی احتیاط سے کام لیا اور صرف اپنے خشک ہونٹ تر کر لیے جس سے ان کے قلب وجگر کو راحت وسکون نصیب ہوا جب کہ ان کے مغل ساتھی اور اس کے گھوڑے نے شدّت پیاس سے مجبور ہوکر ضرورت سے زیادہ ہی پانی پی لیا۔ اس قدر پانی پیا کہ دونوں ہی گر کر ہلاک ہوگئے۔[۱۵۵] قید ہونے کے بعد امیر خسرو اور دیگر قیدیوں کے ساتھ منگولوں کا جو رویہ تھا اس بارے میں پروفیسر جیلانی کامران نے دیباچہ غرۃ الکمال کے حوالے سے لکھا کہ تمام قیدیوں کو رسّی سے باندھ کر زینوں کے ساتھ کس دیا گیا۔ قیدی غول درغول یا پیادہ گھوڑوں سے اس طرح کھینچے جاتے کہ ان کے سر ایک دوسرے سے ٹکراتے۔ مسلسل بھاگنے کی وجہ سے امیر خسرو کے پاؤں زخمی ہوگئے اور ان میں چھالے پڑ گئے۔ لباس، خار دار جھاڑیوں میں پھنس کر چیتھڑے ہوگیا۔ جس سپاہی نے انھیں اپنی زین سے باندھ رکھا تھا، گھوڑے پر ایسے بیٹھا تھا جیسے کوئی چیتا چٹان پر جست لگائے بیٹھا ہو۔ اس کے چوڑے منھ سے بدبُو کے بھبکے آرہے تھے۔ تھکن سے اگر خسرو کے قدم سست پڑ جاتے تو وہ بد بخت کبھی خنجر نکال لیتا اور کبھی تلوار سے انھیں ڈراتا،[۱۵۶] اس پر ستم یہ کہ سفر کے دوران ان کے مغل ساتھی نے ان کے سر پر توبڑہ بھی چڑھا دیا۔[۱۵۷] اس ساری صورت حال کو خسرو نے زیادہ تفصیل کے ساتھ اپنے قصیدے حکم الحکم میں بیان کیا ہے۔ اس قصیدے کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

اسیر کشتم و از بیم آں کہ خون ریزد نمی نماند ز خون در تن نحیف و نزار
چو آب بے سر و پای دو یدم و چو حباب ہزار آبلہ در پا ز رفتن بسیار
نہ پائہائے من از آبلہ جدا شد پوست چناں کہ باز شود در نہ پائے ہا افزار
زرنج سخت شد و جاں چو قبضۂ شمشیر ز ضعف چوب شدہ تن چو دستۂ چغمار

دلے نماند بنایم ز بودہ رہ تشنہ　　دمے شدہ شکم من چوں ماندۂ ناچار
برہنہ ماندہ تن چوں درخت گاہ خزاں　　ہزار بار د چوگل از خواش خارتِ آزار
بگریہ مرد مک دیدہ قطر ہامی ریخت　　چناں کہ گردن عروسی ہا بگسا آزار
فروجۂ کہ مرا پیش کردہ رومی رفت　　نشتہ بر فرشے چوں پلنگ در کسار
کشادہ از دہنش نکہتے چو بوئے مغل　　فتادہ برزنحش سبلتے چو موئے زہار
زماندگی قدمے گر بیماندی می یستوہ　　گہے طفلانہ کشیدے ختم جوں تکمار[۱۵۸]

(قصیدہ حکم الحکم)

اس جنگ میں شہادت پانے اور بچھڑ جانے والے دوستوں کی یاد خسرو کو بے چین رکھتی۔ ڈاکٹر وحید مرزا کا بیان ہے کہ:

> کتنے ہی عزیز ہوں گے جو اس ہنگامے میں ان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہوگئے، کیسی کیسی صورتیں ہوں گی جو مغلوں کے بے پناہ تیروں اور بے محابا تلواروں نے ہمیشہ کے واسطے خاک میں پنہا کردیں، ان دوستوں کی موت کا رنج خسرو کو اپنی جان کی سلامتی سے زیادہ ہوا اور جگہ جگہ اپنے اس رنج والم کا بہت ہی دردناک الفاظ میں ذکر کرتے ہیں۔[۱۵۹]

انھوں نے ''اپنے مربی کی شہادت پر دو نہایت ہی دردانگیز اور الم ناک مرثیے لکھے۔''[۱۶۰] ان کا لکھا ہوا مرثیہ جب دلّی پہنچا تو مہینوں تک لوگ گھر گھر ان مرثیوں کے اشعار پڑھتے رہے اور اپنے مقتول عزیزوں پر نوحہ کرتے رہے۔[۱۶۱] اس مرثیے کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں تاکہ غم کی اس شدت کو محسوس کیا جاسکے:

واقعہ است ایں بلا از آسماں آمد پدید　　آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید
راہ در بنیاد عالم داد سیل فتنہ زا　　رخنۂ کامسال در ہندوستاں آمد پدید
مجلسِ یاراں پریشاں شد چو برگ گل زیاد　　برگ ریزی گوئی اندر بوستاں آمد پدید
بسکہ آبِ چشم خلقے شد رواں در چار سو　　پنج آبے دیگر اندر مولتاں آمد پدید
جمع شد سیارہ در چشمم مگر طوفاں شود　　چوں برج آبی کہ انجم را قراں آمد پدید
تاچہ ساعت بُد کہ شاہ از مولتاں لشکر کشید　　تیغ کافر کش بر اے کشتن کافر کشید
چوں خبر کر دندش از دشمن براں قوت کہ داشت　　بے محابا چشم در سر کرد ورایت بر کشید

آنچناں رنگیں کنم امسال خاک از خونِ شاہ کز زمیں باید شفق را گونۂ احمر کشید
او دریں تدبیر و آگہ نے کہ تدبیر فلک صفحۂ تدبیر را خطِ مشیت در کشید
تاچہ ساعت بد کہ کافر بر سر لشکر کشید میگذیستد جوق جوق از آب و ناگہ در کشید[۱۶۲]

خسرو کا مرثیہ گیارہ بندوں کے ترجیع بند کی صورت میں ہے۔ جو اپنی اثر انگیزی کے لحاظ سے دنیا کے کسی بھی مرثیے کے مقابل رکھا جاسکتا ہے۔[۱۶۳] یہ تمام کے تمام بند اور مزید کچھ اشعار کو ملا عبدا لقادر نے ''منتخب التواریخ'' میں بھی درج کیا ہے۔[۱۶۴] مرثیے کا اثر اتنا گہرا تھا کہ دہلی کے شاہی محل سے لے کر کوچہ و بازار تک پر اس مرثیے کی وجہ سے ایک عجیب سی سوگواری چھائی ہوئی تھی۔ مرثیے میں انھوں نے شہزادے کی ملتان سے روانگی، میدان جنگ میں اس کی اور اس کے ساتھیوں کی دلیری اور جاں بازی، مغلوں کی پسپائی اور ہندوستانی فوج کی نماز ظہر کی ادائیگی، مغلوں کا غیر متوقع حملہ اور شہزادے کی شہادت اور آخر میں ملتان کے رنج وغم کی تصویر کو مؤثر پیرائے میں پیش کیا ہے۔[۱۶۵]

برنی نے بھی تاریخ فیروز شاہی میں اس مرثیے کا ایک شعر نقل کیا ہے۔ شعر ملاحظہ کیجیے:

روز چوں باقی نہ بود آں آفتاب ملک را
روز چیزے بود کان آفتاب افتادہ شد[۱۶۶]

خسرو نے ایک اور مرثیے میں بھی ان واقعات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کا مطلع ہے:

اے دل بہ غم نشیں کہ ز شادی نشاں نماند
اے دیدہ خوں گری کہ طرب دو جہاں نماند[۱۶۷]

اس واقعے کے بعد خسرو کیوں کہ دو برس تک سیاسی ہنگاموں سے دور اپنی والدہ اور عزیزوں کے ساتھ پٹیالی میں رہے۔[۱۶۸] غالباً اسی وجہ سے دو برس قید کا قصہ زبان زدِ عام ہوا۔ ظاہر سی بات ہے اس جنگ میں مسلمانوں کو ذلت آمیز شکست اور بڑی ہزیمت اٹھانی پڑی۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے خسرو کا بیان ہے کہ:

ہمیں بدان کہ ز امسال در حد ملتان
شکستہ میمنۂ مومن از صف کفار[۱۶۹]

اپنی رباعیوں میں بھی خسرو نے اس سانحے کو پیش کرتے ہوئے شدید رنج والم کا اظہار کیا ہے۔[۱۷۰] مثلاً:

در جنگ مغل کہ تیر کین شد پرتاب ہم تاب روی رفت و ہم روی زرتاب
زاں کشتہ و خستہ کاندر آب افتادند آں آب ہمہ خون شد و آن خون ہمہ آب

جمعی ہمہ گردن بر سن کردہ گرو بودند چو خون کُشتگان اندر رو
ہم خار ہمی گرفت دامن کہ مپری ہم آبلہ می فتاد در پاکہ مرو[۱۷۱]

ہندوستان کی تاریخ میں بڑی بڑی لڑائیاں لڑی گئیں۔ بہت بڑے بڑے سورما مارے گئے۔ آبِ لاہور کے قریب لڑی جانے والی اس لڑائی اور اس کے ہیرو شہزادہ سلطان کی شہادت کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے۔[۱۷۲] تاریخ کا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ایک ایسا شخص جس کی شہرت برصغیر سے نکل کر ایران، افغانستان اور وسط ایشیائی ریاستوں سے ہوتی ہوئی یورپ تک پہنچی، اس کے ساتھ تاریخ نے کیسا بے رحمانہ سلوک روا رکھا۔ خسرو اور دیگر ہم عصر شعرا کی شاعری میں جو سوز و گداز دکھائی دیتا ہے وہ دراصل معاشرے کے انھیں رویوں کی دین ہے۔ ان سانحات اور المیوں کو پڑھ کر نہ صرف ہمیں ان کی زندگی پر رحم آتا ہے بلکہ وہ لوگ خود بھی اپنی زندگی پر رحم کھاتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ:

ماجرا اے دوست پر سیدی کہ چوں بگذشت حال
اے سرت گر دم چہ مپرسی بدشواری گذشت[۱۷۳]

خسرو کو ''ملتان کی بربادی کی یاد رہ رہ کر ستاتی۔''[۱۷۴] اس جنگ میں ہندوستانی افواج ذلت آمیز شکست ہوئی۔ انھیں بڑی ہزیمت اٹھانی پڑی۔ برنی بھی اس شکست کی تائید کرتا ہے۔[۱۷۵] لیکن خسرو نے اپنے مرثیے میں جوش اور آہنگ پیدا کرنے کے لیے کہیں کہیں مبالغے سے کام لیا ہے۔ مغلوں کے اس حملے کو خسرو آسمانی بلا اور قیامت سیل فتنہ قرار دینے کے باوجود ہندوستانی فوج جس بہادری اور پامردی سے لڑی اس کا مبالغہ آمیز نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

برزمیں از خوں شدہ دریا پدید روشنی گشتہ ز عالم نا پدید
از مغل ہر سو فغاں برداشتہ است خیزی از جہاں بر خاستہ[۱۷۶]

یعنی ان خنجروں نے بہادروں کے ناف چیر ڈالے، ان کے پہلوانوں کو پسپا کیا، وہ شیروں کی طرح ہر طرف بڑھے، زمین سے خون کا دریا ابلنے لگا، دنیا سے روشنی جاتی رہی اور مغلوں کی طرف سے آہ وزاری بلند ہونے لگی اور قیامت کا سماں بندھ گیا۔[۱۷۷] لیکن انجام کار ہندوستانی فوج ان چنگیز خانیوں کے سامنے پسپا ہوگئی۔ اس پسپائی پر خسرو خود بھی خون کے آنسو روئے اور جس طرح ہندوستان کے لوگ روئے ان کی بھی پوری تصویر کھینچ کر رکھ دی۔ اس طویل مرثیے میں انھوں نے لکھا کہ:

آسماں یا با ہزاراں دیدہ بر اہل زمیں ہمچو یارانِ بہاری بر گیا بگر یستند

خلق ملتاں مرد و زن گریہ کناں و موکناں کو بکوی و سو بسوی و جا بجا بگریستند[۱۷۸]

خسرو کے کلام میں ان واقعات کو پڑھ کر ہم تاریخ کے اس دور میں ہونے والے اس اہم سانحے کے ایک ایک پہلو سے پردہ اٹھا سکتے ہیں۔ وہ اپنے کلام کی روشنی میں ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک مؤرّخ کا فریضہ بھی انجام دیتے نظر آتے ہیں۔ اسیری اور رہائی کے دوران کی جانے والی حکمت عملی کو دیکھتے ہوئے پروفیسر محمد حبیب کی یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ وہ بلبن دور حکومت میں شہزادہ محمد شہید کے صرف ندیم ہی نہ تھے بلکہ ایک فوجی افسر بھی تھے۔[۱۷۹]

اس واقعے کے بعد ساری زندگی خسرو کو مغلوں سے نفرت رہی۔ بعد میں بھی مغلوں نے ہندوستان پر کئی حملے کیے اور قتل و غارت گری کا بازار گرم رہا۔ علاء الدین خلجی کے عہد میں اس فتنے کے سد باب کے لیے سنجیدہ کوشش کی گئی۔ اس کے عہد میں پہلا حملہ ۶۹۷ھ میں کدر نامی ایک مغل سردار نے کیا جس نے ستلج اور جہلم کو پار کر کے قصور اور جالندھر کے علاقوں میں خوب لوٹ مار مچائی لیکن انوع خاں نے مغلوں کو شکست دے کر بھگایا۔ اس کے بعد ۶۹۸ھ میں ایک اور مغل سردار قتلغ خواجہ نے ہندوستان کا رخ کیا اور دہلی کے قریب تک آ پہنچا جس کے بارے میں خسرو اپنی مثنوی 'عشقیہ' میں کہتے ہیں کہ:

ازاں پس بود قتلغ خواجہ گستاخ قوی تر شجرۂ معلونہ را شاخ
بجد کیلی آمد کافراں سال شہ آن جرأت مبارک دید در فال[۱۸۰]

اس وقت بادشاہ، خود مغلوں کے مقابلے کے لیے نکلا۔ تیسرا حملہ توغی کی قیادت میں مغلوں نے کیا اور دہلی کو تقریباً محصور کر لیا۔ یہ حملہ ۷۰۵ھ میں ہوا۔ اس بار ملک کافور نے مغلوں کو شکست فاش دی۔ علی بیگ اور قوتاق نامی مغل سپہ سالار قید کر کے دہلی لائے گئے۔[۱۸۱] فرشتہ کے مطابق انھیں ہاتھیوں سے کچلوا کر قتل کیا گیا اور ان کے ساتھیوں کو تلوار سے کاٹ کر ان اعضا سے مینار بنائے گئے۔ تھوڑے عرصے بعد کبک خاں نامی مغل سردار نے حملہ کیا اور ناگور تک پہنچ گیا۔ اس مرتبہ بھی ملک کافور نے مقابلہ کیا اور کبک خاں کو گرفتار کر کے دہلی لے آیا۔ پانچواں حملہ دو مغل سرداروں کی سرکردگی میں ہوا۔ ملک کافور اور ملک غازی (تغلق) نے سخت ہزیمت کے بعد انھیں بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس بار بھی سیکڑوں مغل قید ہوئے اور انھیں دہلی لا کر ہاتھیوں سے روندا گیا اور قلعے کی دیواروں پر لٹکایا گیا۔[۱۸۲] ان واقعات پر خسرو خوشی کا اظہار کرتے ہوئے بیان کرتے ہیں کہ:

شد از حصار تتاری و چینی آویزاں
چو زنگیان نگو نسار از عمارت نو[۱۸۳]

اس کے بعد علاء الدین کے عہد تک مغلوں کی پھر کبھی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ ہندوستان کا رخ کریں۔[۱۸۴] لطف کی بات یہ ہے کہ ان تمام حادثات و سانحات اور تاریخی واقعات کو ہم امیر خسرو کے کلام میں تلاش کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد کا یہ کہنا درست معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ''فارسی شاعری کو تاریخی عناصر سے روشناس کر کے اس کا دامن بہت وسیع کر دیا۔''[۱۸۵] قران السعدین، مفتاح الفتوح، خضر خاں دول رانی، نُہ سپہر اور تغلق نامہ وغیرہ تاریخی لحاظ سے نہایت اہم ماخذ سمجھے جاتے ہیں۔ ان مثنویوں میں موجود اکثر واقعات میں خسرو خود شریک تھے۔ ایک طرح سے یہ نظمیں چشم دید گواہ کا بیان ہونے کے سبب زیادہ قابل اعتماد حوالہ سمجھی جاتی ہیں۔[۱۸۶] ان کے بعض اہم مرثیوں میں بھی رنج والم کی خاص فضا نظر آتی ہے۔ ملک محمود خانخانا می خلف جلال الدین خلجی اور اپنے بیٹے محمد وغیرہ پر لکھے گئے مرثیے بھی اس حوالے سے کافی اہمیت کے حامل ہیں۔[۱۸۷] تغلق نامہ بھی اس عہد کی مفصل تاریخ ہے[۱۸۸] جس میں بے شمار ایسے سانحات ہیں جس پر خسرو نے اشعار کہے۔ ''اگر ان کے تمام اشعار جمع کر دیے جائیں تو ان کی وطنی محبت کی اور بھی زیادہ صحیح تصویر سامنے آجائے۔''[۱۸۹] لیکن اختصار کے خیال سے یہاں مزید وضاحت کی گنجائش نہیں:

> امیر خسرو وہ پہلے اہم شاعر نظر آتے ہیں جنھوں نے کئی مثنویات جنگ سے متعلق لکھی ہیں۔ ان مثنویات کو شاعرانہ محاسن کے علاوہ تاریخی مآخذ کے طور پر قبول کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایلیٹ اینڈ ڈاؤسن نے اپنی اہم تاریخ History of India as told by its own Historians میں امیر خسرو کو بطور مؤرّخ شامل کیا ہے۔[۱۹۰]

وہ اگرچہ ہندی نژاد تھے لیکن ایرانی شعرا کو بھی ان کی زبان دانی کا اعتراف کرنا پڑا۔ مولانا جامی بہارستان میں رقم طراز ہیں کہ 'خمسہ نظامی' کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا۔ خود ایرانی بھی امیر خسرو کو طوطیٔ ہند کے خطاب سے یاد کرتے تھے۔[۱۹۱] شبلی نے اس بات کی تائید میں عرفی اور خواجہ حافظ کے اشعار نقل کیے ہیں:

بروح خسرو ازیں پارسی شکر دادم　　کہ کام طوطیِ ہندوستاں شود شیریں[۱۹۲] (عرفیؔ)

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند　　زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود[۱۹۳] (حافظؔ)

آذریؔ نے جواہر الاسرار میں لکھا کہ شیخ سعدی شیرازی بھی خسرو سے ملنے شیراز سے دہلی آئے لیکن بعض تذکرہ نویسوں نے صراحتہً اس واقعے سے انکار کیا ہے۔[۱۹۴] اس بات میں کچھ شبہ نہیں کہ خسرو کے عہد سے لے کر آج تک ہندوستان کے طول وعرض سے لے کر ایران، افغانستان اور وسط ایشیائی ریاستوں میں خسرو

پر سینکڑوں مقالات تحریر کیے گئے۔ لہٰذا ہمیں بھی اس بات پر فخر ہونا چاہیے کہ اپنے اشعار میں ''خون رونے اور خون رلانے والے امیر خسرو''[۱۹۵] وہ پہلے ہندوستانی شاعر ہیں جنھوں نے ''ہندوستان کی خاک کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنایا... ان کا دل ہندوستان کی مٹی سے بنا تھا۔ انھوں نے فارسی اور بھاشا کی آمیزش سے ہندوستان میں مسلمانوں کے عہد میں ایک نئی زبان اور نیا تمدنی ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی اور سب سے پہلے اس ملی جلی زبان میں شاعری کی بنیاد رکھی۔''[۱۹۶] افسوس کہ ان کا پورا ہندوی کلام آج تک دست یاب نہ ہوسکا، ورنہ اس دور کے نہ جانے اور کتنے سیاہ باب عیاں ہوجاتے اور گریہ و بکا کے کتنے باب کھل جاتے۔ وہی گریہ و بکا جس کے بارے میں خود خسرو نے کہا کہ:

سرود ذوق فراواں شنیدہ ای اکنوں
بیا ز خسرو و ذوقِ فغاں و زاری پرس[۱۹۷]

اور جس کی جانب حنیف نجمی نے شیخ محدث دہلوی کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ ایک روز حضرت نظام الدین اولیا نے خسرو سے پوچھا، ''اے ترک تمھاری مشغولیات کا کیا حال ہے'' خسرو نے عرض کیا ''سیدی! رات کے آخری حصے میں اکثر و بیشتر آہ و بکا اور گریہ وزاری کا غلبہ رہتا ہے۔''[۱۹۸]

یہ فطری امر ہے کہ اس دور آشوب میں جب کہ روز نئی سازشیں ہو رہی ہوں اور سیاسی کشمکش نے انسانی سکون اور اطمینان برباد کر دیا ہو، ایک حساس دل شاعر کیوں کر ان حالات سے پیچھا چھڑا سکتا ہے۔ اسی لیے خسرو کے اشعار کو پڑھ کر ''ایسا محسوس ہوتا ہے کہ دھواں اٹھ رہا ہے، معلوم ہوتا ہے رو رہے ہیں، روتے روتے ٹھہر جاتے ہیں اور جب رو لیتے ہیں تو آگے بڑھ جاتے ہیں، ان کی طبیعت میں یہ سوز و گداز، یہ درد آگینی ان صوفیانہ کیفیات سے پیدا ہوئیں جو ان کو فطری طور پر حاصل تھیں۔''[۱۹۹] اور جس کو حضرت نظام الدین اولیا کی صحبت خاص سے مزید جلا ملی۔ سلطان الاولیا حضرت نظام الدین محبوب الٰہی سے ان کی وابستگی اور عقیدت، ان کے مذہبی جذبات اور سوزِ قلب کی آئینہ دار ہے۔ اس سیاسی افراط وتفریط کے ماحول میں روح کے سکون اور اطمینان قلب کے لیے خسرو نے ایک ابدی پناہ گاہ تلاش کر لی تھی۔ انھوں نے اپنے تمام کمالات کو اپنے مرشد برحق کی خدمت اور رضا کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ایسی واضح شہادتیں موجود ہیں کہ انھوں نے اپنے مرشد کی خاطر دربار میں بھی حق گوئی کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا اور شاہ مبارک سے صاف صاف کہہ دیا کہ ''میری جان حاضر ہے۔ آپ نہایت آسانی سے میرا سر قلم کر سکتے ہیں لیکن محبوبِ الٰہی کی بارگاہ میں شرمندگی قبول نہیں۔''[۲۰۰] اس حوالے سے بھی ان کے فارسی کلام سے متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن

خسرو پر مضمون کا اختتام اس عظیم دوہے پر ہی مناسب معلوم ہوتا ہے جسے اپنی تمام تعصّبات کو بھلا کر ہندی اور اردو دونوں ادب سدا اپناتے رہے ہیں۔ یہ دوہا اردو کے ابتدائی زمانے کا عظیم شاہکار سمجھا جاتا ہے۔ یوں تو ان کے بیش تر ہندوی کلام کو ۱۹۱۸ء میں جواہر خسروی کے نام سے مولانا امین چریا کوٹی اور مولانا سید احمد سالم نے مرتب کیا اور جس پر چریا کوٹی نے عالمانہ مقدمہ بھی لکھا۔[۲۰۱] اگرچہ حافظ محمود شیرانی نے جواہر خسروی میں شامل امیر خسرو سے منسوب خالق باری اور دیگر بہت سے اشعار کو امیر خسرو کے اشعار ماننے سے انکار کیا۔[۲۰۲] لیکن اس دوہے کے بارے میں متن کے اختلاف سے قطع نظر، کسی قسم کے شکوک وشبہات کا اظہار نہیں کیا گیا۔ یہ دوہا محبوبِ الٰہی کی وفات سے متعلق ہوتے ہوئے بھی اردو کی ادبی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے امر رہے گا۔ مرشد کی قبر پر پہنچ کر خسرو کا یہ دوہا کہنا، ترک دنیا کر کے وہیں ڈیرے ڈال دینا اور کچھ ماہ بعد اس دنیا سے رخصت ہوجانا، موضوع جس قدر عالم گیر نوعیت کا ہوگیا ہے خسرو کا اظہار بھی اتنا ہی انفرادی ہوگیا ہے۔[۲۰۳]

وصال کے خاص متصوفانہ پس منظر میں خسرو نے ایسا کمال کر دکھایا ہے کہ اس دوہے کو ہمیشہ زندہ ادب میں شمار کیا جائے گا۔ خصوصاً اپنے مرشد کے انتقال جیسے بڑے سانحے کو پیش کرتے ہوئے بھی خسرو کا شعر کی فضا کو سوگوار نہ ہونے دینا، فن کمال کی معراج نہیں تو اور کیا ہے۔ خسرو کا ایک فارسی شعر بھی اسی طرح کا اظہار لیے ہوئے ہے ملاحظہ کیجیے:

ایں مکانیست کہ منزل گہہ جاناں بودہ است
سروِ رہ آمدہ شُد خراماں بودہ است[۲۰۴]

لیکن اس ہندوی دوہے جیسی دوسری نظیر غالباً پوری اردو شاعری کی تاریخ میں نہ مل سکے:

گوری سووے سیج پر　　مُکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے　　سانجھ بھئی چوندیس[۲۰۵]

غرض کہ ان کا کلام اپنی مقبولیت کی وجہ سے سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا اور ان سات صدیوں میں یہ کلام ہماری لوک روایت کا حصہ بن گیا۔ لاکھوں کروڑوں زبانوں پر چڑھنے سے اس میں تحریف اور تبدیلیاں ضرور ہوئی ہوں گی۔[۲۰۶] انھوں نے ہندوی کلام میں جو زبان استعمال کی ہے وہ اس زمانے کی ادبی زبان بھی نہیں۔ ظاہر سی بات ہے کہ فارسی کی پیروی میں یہ ممکن بھی نہ تھا لیکن یہ ضرور ہے کہ اس قسم کی پہلی کوشش خسرو نے ہی کی کہ شاعری عوام کی زبان میں کی جائے۔ اس عہد میں خسرو کا کوئی مقلد نہیں تھا۔ ان کی پہیلیاں، دو سخنے اور

گیت ان کی زندگی کے ساتھ ہی ختم ہو گئے لیکن اس سے ان کے رتبے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ انھوں نے اپنی شاعری سے یہ ضرور ثابت کر دیا کہ کھڑی بولی میں بھی شاعری کی جاسکتی ہے۔[۲۰۷] خسرو کے انھیں کمالات کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر جمیل جالبی درست کہا کہ:

> اردو زبان و ادب کے وہ شاعر اوّل جن کی مٹھاس آج بھی زبان میں شہد گھول رہی ہے۔ امیر خسرو دو تہذیبوں کے امتزاج کے وہ گل نورس ہیں جو ابھرتی پھیلتی تہذیبوں کے ایسے ہی موڑ پر ظہور میں آتے ہیں اور خود تہذیب کی علامت بن جاتے ہیں۔ امیر خسرو ''ہند مسلم ثقافت'' کی وہ زندہ علامت ہیں کہ رہتی دنیا تک وہ اس تہذیب کے اوّلین نمائندے کی حیثیت سے یادگار رہیں گے۔[۲۰۸]

خسرو کے کلام کے جائزے کے بعد اس بات میں شبہے کی کوئی گنجائش نہیں کہ ان کا کلام نہ صرف شاعری کے بلند ترین معیارات پر کھرا اترتا ہے بلکہ اس عہد کی سیاسی اور سماجی اور معاشی صورت حال کے بے شمار شواہد ان کی شاعری میں تلاش کیے جاسکتے ہیں۔ خسرو کے بارے میں ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ:

> دنیاے شاعری میں بہت کم شاعر ایسے ملیں گے جو تعداد اشعار اور گونا گوں اصناف سخن میں یکساں کمال رکھنے کے اعتبار سے خسرو کے ہم پلہ ہوں۔ پھر ان کے ہاں محض تعداد اشعار اور گونا گوئی اصناف ہی نہیں بلکہ ان کا کلام دنیا کے کسی بڑے سے بڑے شاعر کے مقابلے میں رکھا جاسکتا ہے۔ ان کے ہاں فن کی تمام خوبیاں اوج کمال پر ملتی ہیں۔ شاعری میں جس قدر نئی باتیں ان کے ہاں پائی جاتی ہیں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔[۲۰۹]

یہی وجہ ہے کہ خسرو آج بھی ادبی تاریخ میں زندہ ہیں اور فارسی ادبیات میں تو ان کا نام سعدیؔ اور حافظؔ جیسے شعرا کے ساتھ لیا جاتا رہے گا۔

حواشی

۱۔ عصمت اللہ خان، ایک تہذیبی کیمیا گر، مشمولہ ہم سخن، مجلّہ جناح کالج، کراچی، امیر خسرو نمبر، ۱۹۷۵ء، ص ۱۶۔
۲۔ محمد حسین آزاد، آبِ حیات، مرتّبہ ابرار عبدالسلام، (ملتان: بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی، ۲۰۰۶ء)، ص ۴۳۔ ۴۴۔
۳۔ ظ انصاری، دیباچہ، مشمولہ خسرو کا ذہنی سفر، (دہلی: انجمن ترقیِ اردو ہند ۱۹۸۸ء)۔

۴۔ جمیل جالبی، تاریخ ادب اردو، جلد اوّل، (لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب، ۱۹۸۴ء)، ص ۲۷۔
۵۔ وحید مرزا، امیر خسرو، (دہلی: نیشنل امیر خسرو سوسائٹی، ۱۹۸۶ء)، ص ۵۰۔
۶۔ گوپی چند نارنگ، امیر خسرو کا ہندی کلام مع نسخہ برلن ذخیرۂ اسپرنگر، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء)، ص ۱۴۱۔
۷۔ جمیل جالبی، محولۂ بالا، ص ۳۷۔
۸۔ گوپی چند نارنگ، محولۂ بالا، ص ۲۵۔۲۸۔
۹۔ جمیل جالبی، محولۂ بالا، ص ۶۹۔
۱۰۔ صفدر آہ، امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر، (بمبئی: یونیورسل پریس، سنہ ندارد)، ص ۱۴۔۱۵۔
۱۱۔ تارا چند، امیر خسرو اور ہندوستان، (دہلی: امیر خسرو اکیڈمی، س ن)، ص ۶۔۷۔
۱۲۔ ابواللیث صدیقی، حضرت امیر خسرو اور ہماری لسانی روایت، مشمولہ ہم سخن، محولۂ بالا، ص ۱۴۸۔
۱۳۔ وحید مرزا، محولۂ بالا، ص ۱۵۱۔
۱۴۔ شبلی نعمانی، حیاتِ خسرو، مشمولہ امیر خسرو، مرتبہ، شیخ سلیم احمد، (دہلی: ادارہ ادبیات دلّی، ۱۹۷۶ء)، ص ۵۰۔۵۱۔
۱۵۔ مرزا بایسنغر، بحوالہ وحید مرزا، محولۂ بالا، ص ۱۵۲۔
۱۶۔ اوحدی، بحوالہ شبلی نعمانی، محولۂ بالا، ص ۵۱۔
۱۷۔ ایضاً۔
۱۸۔ گوپی چند نارنگ، محولۂ بالا، ص ۳۰؛ و نیز ڈاکٹر وحید مرزا، محولۂ بالا، ص ۴۰۔
۱۹۔ امیر خسرو، نُہ سپہر، بحوالہ گوپی چند نارنگ، محولۂ بالا، ص ۳۱۔
۲۰۔ ایضاً۔
۲۱۔ گوپی چند نارنگ، محولۂ بالا، ص ۳۱۔
۲۲۔ ایضاً۔
۲۳۔ حافظ محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۷۲ء کے صفحہ ۱۴۰ تا ۱۵۲ میں اس بابت بحث ملاحظہ کیجیے۔
۲۴۔ اقبال صلاح الدین، خسروِ شیریں زباں، (لاہور: مکتبہ میری لائبریری، س ن) ص ۱۴۳۔۱۵۰۔
۲۵۔ جمیل جالبی، محولۂ بالا، ص ۳۰۔
۲۶۔ ایضاً، ص ۳۰۔۳۱۔
۲۷۔ صفدر آہ، محولۂ بالا، ص ۱۷۔
۲۸۔ اقبال صلاح الدین، محولۂ بالا، ص ۱۴۳۔
۲۹۔ تارا چند، محولۂ بالا، ص ۱۲۔
۳۰۔ منشی محمد سعید احمد مارہروی، حیاتِ خسرو، مشمولہ امیر خسرو، مرتبہ: شیخ سلیم احمد، محولۂ بالا، ص ۱۶۸۔
۳۱۔ سر ایلیٹ، بحوالہ سعید احمد مارہروی، محولۂ بالا، ص ۱۶۸۔
۳۲۔ منشی محمد سعید احمد مارہروی، محولۂ بالا، ص ۱۶۷۔۱۶۸۔
۳۳۔ عصمت اللہ خان، محولۂ بالا، ص ۲۴۔۲۵۔

۳۴۔ انصار زاہد، امیر خسرو کی سیاسی زندگی، مشمولہ ہم سخن، محولۂ بالا، ص ۹۳۔
۳۵۔ عصمت اللہ خان، محولۂ بالا، ص ۲۴۔
۳۶۔ عتیق احمد خاں، دربار داری اور خسرو کا رنگ طبیعت، مشمولہ ہم سخن، محولۂ بالا، ص ۷۳۔
۳۷۔ امیر خسرو، تعلق نامہ، مشمولہ ہم سخن، محولۂ بالا، ص ۷۴۔
۳۸۔ عتیق احمد خاں، محولۂ بالا، ص ۷۴۔
۳۹۔ امیر خسرو، تعلق نامہ، مرتبہ، سیّد ہاشمی فرید آبادی، (حیدرآباد دکن: مطبع اردو، ۱۹۳۳ء)، ص ۱۶۔
۴۰۔ منشی محمد سعید احمد مارہروی، محولۂ بالا، ص ۱۶۹۔
۴۱۔ تاراچند، امیر خسرو اور ہندوستان، مشمولہ امیر خسرو، مرتبہ: شیخ سلیم احمد، محولۂ بالا، ص ۳۶۳۔
۴۲۔ نورالحسن انصاری، مقدمہ، مشمولہ امیر خسرو: احوال و آثار، مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن انصاری، (دہلی: مطبع کوہِ نور پریس، ۱۹۷۵ء)، ص ۸۔
۴۳۔ سید حسن عسکری، Amir Khusrau as a Historian، (پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۲ء)، ص ۱۳۔
۴۴۔ محی الدین اظہر، امیر خسرو اور علی گڑھ، (علی گڑھ: نسرین پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۱ء)، ص ۳۳۔
۴۵۔ منشی محمد سعید احمد مارہروی، حیاتِ خسرو، (آگرہ: مطبع اکبری، ۱۹۰۳ء/۱۳۲۱ھ)، ص ۲۳۔
۴۶۔ اقبال صلاح الدین، محولۂ بالا، ص ۴۶۔
۴۷۔ وحید مرزا، محولۂ بالا، ص ۵۹۔
۴۸۔ بحوالہ ڈاکٹر جمیل جالبی، محولۂ بالا، ص ۳۴۔
۴۹۔ سید حسن سجزی، بحوالہ اوراق پارینہ: ایک نایاب قلمی بیاض، مشمولہ نوائے ادب، بمبئی، جولائی ۱۹۵۶ء، ص ۶۰۔ ۶۱۔
۵۰۔ سید حسن سجزی، بحوالہ ڈاکٹر جمیل جالبی، محولۂ بالا، ص ۳۵۔
۵۱۔ منشی محمد سعید احمد مارہروی حیات خسرو، (آگرہ: مطبع اکبری، ۱۹۰۳ء/۱۳۲۱ھ)، ص ۳۱۔ ۳۲۔
۵۲۔ محمد قاسم فرشتہ، تاریخ فرشتہ، جلد اوّل، مترجم، مولوی فدا علی، (حیدرآباد دکن: مطبع جامع عثمانیہ، ۱۹۲۶ء)، ص ۲۹۶۔ ۳۰۵۔
۵۳۔ امیر خسرو، دیوان وسط الحیوٰۃ، محولۂ بالا، ص ۷۹۔
۵۴۔ مہدی، جمیل، امیر خسرو: ایک بلند پایہ مؤرّخ مشمولہ فروغِ اردو، لکھنؤ، امیر خسرو نمبر، اپریل مئی ۱۹۷۲ء، ص ۲۳۵
۵۵۔ محی الدین اظفر، محولۂ بالا، ص ۳۷۔
۵۶۔ حسن برنی، مقالاتِ برنی (کراچی: انجمن ترقیٔ اردو پاکستان، ۱۹۸۶ء)، ص ۱۳۶۔ ۱۴۱۔
۵۷۔ ظ انصاری، خسرو کا ذہنی سفر، محولۂ بالا، ص ۳۵۔
۵۸۔ محمد قاسم فرشتہ (اردو ترجمہ)، محولۂ بالا، ص ۳۰۴۔ ۳۰۵۔
۵۹۔ منشی محمد سعید احمد مارہروی، اشاعت آگرہ، محولۂ بالا، ص ۳۲۔ ۳۳۔
۶۰۔ محمد حبیب، سوانح امیر خسرو، مترجم حیات اللہ انصاری، (الٰہ آباد: ہندوستانی اکیڈمی، ۱۹۸۴ء)، ص ۱۴۔
۶۱۔ ملّا عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ (فارسی)، مرتبہ مولوی احمد علی، (کلکتہ: دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۶۸ء)،

ص ۱۳۱۔

۶۲۔ وحید مرزا، اشاعت دہلی، محولۂ بالا، ص ۶۲۔ ۶۳

۶۳۔ محمد قاسم فرشتہ (اردو ترجمہ)، محولۂ بالا، ص ۳۰۵۔

۶۴۔ وحید مرزا، اشاعت دہلی، محولۂ بالا، ص ۶۳۔

۶۵۔ محمد قاسم فرشتہ (اردو ترجمہ)، محولۂ بالا، ص ۳۰۵۔

۶۶۔ شبلی نعمانی، حیات خسرو، (دہلی: جامعہ ملیہ برقی پریس، س ن)، ص ۶۔

۶۷۔ شفقت رضوی، امیر خسرو کے ہم عصر اردو شعرا، مشمولہ ہم سخن، محولۂ بالا، ص ۱۹۸۔

۶۸۔ مسعود علی محوی، مقدمہ، مشمولہ کلیاتِ حسن سجزی، شاد ایڈیشن، (حیدرآباد دکن: مکتبہ ابراہیمیہ پریس، ۱۳۵۲ھ)، ص ۳۴۔

۶۹۔ ایضاً، ص ۸؛ محوی صاحب نے حیاتِ خسرو نامی جس تصنیف کا ذکر کیا ہے وہ بعینہٖ وہی ہے جو اس سے قبل شعر العجم حصہ دوم میں شامل تھی۔

۷۰۔ شبلی نعمانی، شعر العجم حصہ دوم، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۳۲۴ھ۔ ۱۳۲۵ھ، ص ۴۷؛ غالباً شعر العجم میں شائع ہونے والا خسرو کا سارا مواد بہ عینہٖ حیاتِ خسرو، جامعہ ملیہ برقی پریس، دہلی اور بیانِ خسرو، مطبع الناظر، لکھنؤ نے بعد میں الگ سے شائع کیا۔

۷۱۔ دیکھیے: بیانِ خسرو، از شبلی نعمانی، (لکھنؤ: الناظر پریس، س ن)، سرورق کے بعد والا صفحہ۔

۷۲۔ ملاحظہ کیجیے: 'حواشی'، مشمولہ شعر العجم حصہ دوم، محولۂ بالا، ص ۸: و نیز 'حواشی'، مشمولہ بیانِ خسرو، محولۂ بالا، ص ۸۔

۷۳۔ نقی محمد خان خورجوی، حیاتِ امیر خسرو مع ایجاد موسیقی، کراچی: شیخ غلام علی اینڈ سنز، س ن)، ص ۴۴۔

۷۴۔ صلاح الدین اقبال، محولۂ بالا، ص ۴۶۔

۷۵۔ ممتاز حسین، امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری، (کراچی: پاکستان ہیرالڈ لمیٹڈ، ۱۹۷۵ء)، ص ۱۶۵۔

۷۶۔ ملا عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، مترجم محمود احمد فاروقی، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۶۲ء)، ص ۸۱۔

۷۷۔ ایضاً، منتخب التواریخ (فارسی)، مرتبہ: مولوی احمد علی، محولۂ بالا، ص ۱۳۱۔

۷۸۔ ممتاز حسین، پروفیسر، محولۂ بالا، ص ۱۶۵۔

۷۹۔ معین الدین عقیل، امیر خسرو فرد اور تاریخ، (کراچی: ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۹۷ء)، ص ۳۵۔

۸۰۔ ایضاً، ص ۳۵۔ ۴۱۔

۸۱۔ ضیاء الدین برنی (فارسی)، محولۂ بالا، ص ۱۰۰؛ و نیز اردو ترجمہ، ص ۱۳۱۔ ۱۳۴، ۵۰۵، ۵۲۲، ۵۲۳ دیکھیے۔

۸۲۔ ایضاً، (اردو ترجمہ)، محولۂ بالا، ص ۱۹۰۔

۸۳۔ ایضاً، ص ۱۸۹۔

۸۴۔ خسرو، امیر، دیوانِ وسط الحیات، بحوالہ، ڈاکٹر وحید مرزا، محولۂ بالا، ص ۶۸؛ موازنے کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر معین الدین عقیل، محولۂ بالا، ص ۳۵۔

۸۵۔ میر حسن سجزی، بحوالہ تاریخ مبارک شاہی، از یحییٰ بن احمد سرہندی، مترجم ڈاکٹر آفتاب اصغر، (لاہور: مرکزی اردو بورڈ)، ص ۱۱۱۔ ۱۱۶۔

۸۶۔ محمود احمد فاروقی، 'حواشی'، مشمولہ منتخب التواریخ (اردو ترجمہ)، محولۂ بالا، ص ۸۱۔
۸۷۔ ضیاء الدین برنی، (فارسی)، محولۂ بالا، ص ۱۱۰؛ و نیز اردو ترجمہ، محولۂ بالا، ص ۱۹۰۔
۸۸۔ محمد قاسم فرشتہ (اردو ترجمہ)، محولۂ بالا، ص ۲۹۳۔ ۳۰۵، ۴۰۸۔ ۴۰۹ و دیگر صفحات۔
۸۹۔ ملا عبدالقادر بدایونی، سبب تالیف، مشمولہ منتخب التواریخ (اردو ترجمہ)، محولۂ بالا، ص ۳۲۔
۹۰۔ ایضاً، ص ۳۱، ۷۷۵۔
۹۱۔ آفتاب اصغر، 'مقدمۂ مترجم'، مشمولہ تاریخ مبارک شاہی (اردو ترجمہ)، محولۂ بالا، ص ۴۲۔
۹۲۔ یحییٰ بن احمد سرہندی، تاریخ مبارک شاہی (اردو ترجمہ)، محولۂ بالا، ص ۱۱۰۔
۹۳۔ محمد سعید مارہروی، اشاعت آگرہ، محولۂ بالا، ص ۳۴۔
۹۴۔ وحید مرزا، محولۂ بالا، ص ۶۳۔
۹۵۔ یحییٰ بن احمد سرہندی، تاریخ مبارک شاہی (فارسی)، تصحیح، محمد ہدایت حسین، (کلکتہ: دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۱۹۳۱ء)، ص ۴۳۔ ۵۱؛ و نیز اردو ترجمہ، ص ۱۱۰۔ ۱۱۷۔
۹۶۔ مسعود علی محوی، محولۂ بالا، ص ۳۵۔
۹۷۔ ایضاً۔
۹۸۔ نثار احمد فاروقی، مقدمہ، مشمولہ فوائد الفواد، مرتبہ: خواجہ امیر حسن علا سجزی، مترجم خواجہ حسن نظامی، (دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۱ء)، ص ۱۶۱۔
۹۹۔ یحییٰ بن احمد سرہندی، (فارسی)، ص ۴۵۔
۱۰۰۔ سیدہ فلیحہ کاظمی، مرثیہ حسن سجزی در رثای محمّد خان شہید و دیگر آثارش، مشمولہ اورینٹل کالج میگزین، لاہور، اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۳ء، ص ۶۵۔
۱۰۱۔ سید احمد دہلوی، فرہنگِ آصفیہ، جلد سوم، (لاہور: مکتبۂ سہیل لمیٹڈ، ۱۹۷۴ء)، ص ۳۳۲۔
۱۰۲۔ میر حسن سجزی، بحوالہ، یحییٰ بن احمد سرہندی (اردو ترجمہ)، محولۂ بالا، ص ۱۱۲۔
۱۰۳۔ یحییٰ بن احمد سرہندی، (اردو ترجمہ)، اردو ترجمہ، محولۂ بالا، ص ۱۱۰۔
۱۰۴۔ ملا عبدالقادر بدایونی، (فارسی)، محولۂ بالا، ص ۱۳۱۔
۱۰۵۔ ضیاء الدین برنی (فارسی)، ص ۱۰۹۔
۱۰۶۔ سید قاسم محمود، انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا، (کراچی: شاہ کار بک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۸ء)، ص ۴۹۶، ۵۰۹۔
107.(a) http://www.distancesfrom.com/distance-from-ravi-river-to-Okara/DistanceHistory/10616933.aspx
(b) http://www.distancesfrom.com/pk/distance-from-multan-to-Depalpur-Pakistan/DistanceHistory/18050239.aspx
۱۰۸۔ میر حسن سجزی، بحوالہ، یحییٰ بن احمد سرہندی، فارسی، محولۂ بالا، ص ۴۵۔ ۴۶۔
۱۰۹۔ ظ انصاری، محولۂ بالا، ص ۱۸۔
۱۱۰۔ سیّد معین الحق، مقدمہ، تاریخ فیروز شاہی (اردو ترجمہ)، محولۂ بالا، ص ۳۱۔ ۳۲۔
۱۱۱۔ ضیاء الدین برنی (فارسی)، محولۂ بالا، ص ۳۶۰۔

۱۱۲۔ ممتاز حسین، محولۂ بالا، ص ۱۶۵۔
۱۱۳۔ ضیاء الدین برنی (فارسی)، محولۂ بالا، ص ۱۰؛ و نیز اردو ترجمہ، محولۂ بالا، ص ۱۹۰۔
۱۱۴۔ عصامی، فتوح السلاطین (فارسی)، مرتبہ ای ایس یوشع، (مدراس: یونی ورسٹی آف مدراس، ۱۹۴۸ء)، ص ۱۸۱۔
۱۱۵۔ محمد قاسم فرشتہ (اردو ترجمہ)، محولۂ بالا، ص ۳۰۵۔۳۰۶۔
۱۱۶۔ ملا عبدالقادر بدایونی (فارسی)، محولۂ بالا، ص ۱۵۷۔
۱۱۷۔ امیر خسرو، دیباچۂ غیر الکمال، بحوالہ جیلانی کامران، مشمولہ امیر خسرو کا صوفیانہ مسلک، (لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۲ء)، ص ۹۳۔
۱۱۸۔ نثار احمد فاروقی، پروفیسر، مقدمہ، محولۂ بالا، ص ۱۶۱۔
۱۱۹۔ سید ہاشمی فرید آبادی، تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت، جلد اوّل، (کراچی: انجمن ترقیٔ اردو پاکستان، ۱۹۸۷ء)، ص ۲۰۸۔
۱۲۰۔ ضیاء الدین برنی (اردو ترجمہ)، محولۂ بالا، ص ۱۹۰۔
۱۲۱۔ محمد قاسم فرشتہ، محولۂ بالا، ص ۳۵؛ مترجم نے سہواً خضر خاں دیولدی لکھا جب کہ درست نام 'مثنوی خضر خاں دیول رانی' ہے۔
۱۲۲۔ تفصیلات کے لیے امیر خسرو کی مثنوی 'خضر خاں دیول رانی' ملاحظہ کیجیے، نیشنل کمیٹی سات سو سالہ تقریبات، (لاہور: استقلال پریس، ۱۹۷۵ء)، مکمل عکس۔
۱۲۳۔ شیخ محمد اکرام، آب کوثر، (لاہور فیروز سنز، ۱۹۶۵ء)، ص ۱۷۸۔
۱۲۴۔ حسن برنی، محولۂ بالا، ص ۱۴۲۔
۱۲۵۔ زینت ساجدہ، امیر خسرو، مشمولہ صبا، حیدر آباد دکن، فروری ۱۹۶۱ء، ص ۱۱۔
۱۲۶۔ مسعود علی محوی، محولۂ بالا، ص ۳۵۔
۱۲۷۔ شبلی نعمانی، شعر العجم، حصہ دوم، محولۂ بالا، ص ۴۷۔۷۵۔
۱۲۸۔ ایضاً، 'حواشی'، مشمولہ شعر العجم، حصہ دوم، محولۂ بالا، ص ۴۷۔
۱۲۹۔ ملا عبدالقادر بدایونی (فارسی)، محولۂ بالا، ص ۱۳۱۔
۱۳۰۔ ایضاً، ص ۱۳۷۔
۱۳۱۔ وحید مرزا، محولۂ بالا، ص ۶۵۔
۱۳۲۔ ملاحظہ کیجیے شعر العجم، حصہ دوم، سرورق کے بعد والا صفحہ۔
۱۳۳۔ محمد سعید احمد مارہروی، حیاتِ خسرو، اشاعت آگرہ، محولۂ بالا، ملاحظہ کیجیے سرورق جس میں واضح طور پر (۱۹۰۳ء) ۱۳۲۱ھ درج ہے۔ جب کہ شعر العجم کا سنہ اشاعت ۱۳۲۵ھ (۸۔۱۹۰۷ء) ہے۔
۱۳۴۔ ایضاً، ص ۳۴۔
۱۳۵۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، محولۂ بالا، ص ۳۷۔
۱۳۶۔ نظامی بدایونی، قاموسِ مشاہیر، جلد اوّل، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۲۴ء، ص ۲۸۳۔
۱۳۷۔ ظفر حسن بی اے، مقدمہ، مشمولہ خلاصۃ التواریخ، از سجان رائے بھنڈاری، (دہلی: مطبع جی اینڈ سنس، ۱۹۱۸ء)، ص ج۔
۱۳۸۔ سجان رائے بھنڈاری، خلاصۃ التواریخ، بہ تصحیح ظفر حسن، محولۂ بالا، ص ۲۰۴۔

۱۳۹۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی، خزانۂ عامرہ، (کان پور: مطبع نول کشور، ۱۹۰۰ء)، ص ۲۱۰۔
۱۴۰۔ ایوب قادری، تعارف، مشمولہ مآثر الکرام، از میر غلام علی آزاد بلگرامی، مترجم مولانا شاہ محمد خالد میاں فاخری، (کراچی: دارالمصنّفین، ۱۹۸۳ء)، ص ۱۰۔
۱۴۱۔ شمس بریلوی، مقدمہ، مشمولہ مآثر الکرام (اردو ترجمہ)، محولۂ بالا، ص ۹۰۔
۱۴۲۔ ایوب قادری، ڈاکٹر، محولۂ بالا، ص ۷۔
۱۴۳۔ منشی افتخار عالم، بحوالہ 'حواشی' اقبال صلاح الدین، دیباچہ، مشمولہ کلیاتِ غزلیاتِ خسرو، جلد اوّل، مرتبہ اقبال صلاح الدین، (لاہور: پیکیجز لمیٹڈ، ۱۹۷۲ء)، ص ۷۹۔
۱۴۴۔ اقبال صلاح الدین، 'حواشی'، مشمولہ: دیباچہ کلیاتِ غزلیاتِ اقبال، جلد اوّل، محولۂ بالا، ص ۷۹۔
۱۴۵۔ معین الدین عقیل، محولۂ بالا، ص ۳۸۔
۱۴۶۔ وحید مرزا، محولۂ بالا، ص ۴۵۔۴۶؛ یہاں ملتان سے مراد آب لاہور کا وہ حصہ ہے جہاں امیر خسرو کو گرفتار کیا گیا تھا۔
۱۴۷۔ امیر خسرو، بحوالہ ملا عبدالقادر بدایونی، فارسی، محولۂ بالا، ص ۱۵۴۔
۱۴۸۔ ایضاً، ص ۱۵۳۔
۱۴۹۔ ایضاً، ص ۱۴۸۔
۱۵۰۔ میر حسن سجزی، بحوالہ یحییٰ بن احمد سرہندی (اردو ترجمہ)، محولۂ بالا، ص ۱۱۱۔۱۱۶۔
۱۵۱۔ ممتاز حسین، محولۂ بالا، ص ۱۶۸۔
۱۵۲۔ مولوی ذکاء اللہ، تاریخ ہندوستان، جلد اوّل، (علی گڑھ: مطبع انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۱۵ء)، ص ۳۹۴۔۳۹۵۔
۱۵۳۔ عصامی، محولۂ بالا، ص ۱۸۱۔
۱۵۴۔ امیر خسرو، 'خضر خاں دول رانی'، بحوالہ ڈاکٹر معین الدین عقیل، ص ۳۸۔۳۹۔
۱۵۵۔ معین الدین عقیل، محولۂ بالا، ص ۳۸۔
۱۵۶۔ جیلانی کامران، محولۂ بالا، ص ۹۳۔۹۴۔
۱۵۷۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، محولۂ بالا، ص ۳۶۔
۱۵۸۔ امیر خسرو، 'قصیدہ حکم الحکم'، بحوالہ ڈاکٹر ممتاز حسین، محولۂ بالا، ص ۱۶۷؛ و نیز ڈاکٹر معین الدین عقیل، محولۂ بالا، ص ۳۶۔۳۷۔
۱۵۹۔ وحید مرزا، محولۂ بالا، ص ۶۹۔
۱۶۰۔ معین الدین عقیل، محولۂ بالا، ص ۳۹۔
۱۶۱۔ شبلی نعمانی، بیانِ خسرو، محولۂ بالا، ص ۸۔
۱۶۲۔ امیر خسرو، بحوالہ ملا عبدالقادر بدایونی (فارسی)، ص ۱۳۸۔۱۳۹۔
۱۶۳۔ اقبال صلاح الدین، 'حواشی' کلیاتِ اقبال، جلد اوّل، محولۂ بالا، ص ۷۸۔
۱۶۴۔ بحوالہ ملا عبدالقادر بدایونی (فارسی)، ص ۱۳۸۔۱۵۴۔
۱۶۵۔ محی الدین اظفر، محولۂ بالا، ص ۳۹۔۴۱۔
۱۶۶۔ بحوالہ ضیاء الدین برنی (فارسی)، محولۂ بالا، ص ۱۱۰؛ و نیز اردو ترجمہ، محولۂ بالا، ص ۱۹۰۔
۱۶۷۔ بحوالہ ڈاکٹر معین الدین عقیل، محولۂ بالا، ص ۳۹۔

۱۶۸۔ ظ انصاری، محولۂ بالا، ص ۳۵۔
۱۶۹۔ بحوالہ ممتاز حسین، محولۂ بالا، ص ۱۶۸۔
۱۷۰۔ معین الدین عقیل، ڈاکٹر، محولۂ بالا، ص ۴۰۔
۱۷۱۔ امیر خسرو، بحوالہ ڈاکٹر وحید مرزا، محولۂ بالا، ص ۷۰۔۷۱۔
۱۷۲۔ سید حسن برنی، محولۂ بالا، ص ۱۶۰۔۱۶۱۔
۱۷۳۔ شبلی نعمانی، محولۂ بالا، ص۔
۱۷۴۔ ظ انصاری، محولۂ بالا، ص ۴۳۔
۱۷۵۔ ضیاء الدین برنی (اردو ترجمہ)، محولۂ بالا، ص ۱۹۰۔
۱۷۶۔ امیر خسرو، قران السعدین، ص ۶۲، بحوالہ وطن اور حبِ وطن، از سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مشمولہ خسرونامہ المعروف بہ خسرو شناسی، مؤلف ظ انصاری و ابوالفیض سحر، (لاہور: مشتاق بک ڈپو، س ن)، ص ۷۶۔
۱۷۷۔ ایضاً۔
۱۷۸۔ امیر خسرو، قران السعدین، بحوالہ وطن اور حبِ وطن، محولۂ بالا، ص ۷۶۔۷۷۔
۱۷۹۔ محمد حبیب، محولۂ بالا، ص ۱۵۔
۱۸۰۔ امیر خسرو، بحوالہ ڈاکٹر وحید مرزا، محولۂ بالا، ص ۱۰۰۔
۱۸۱۔ وحید مرزا، محولۂ بالا، ص ۱۰۰۔
۱۸۲۔ فرشتہ، محمد قاسم (اردو ترجمہ)، محولۂ بالا، ص ۳۹۰۔ ۳۹۳۔
۱۸۳۔ امیر خسرو، بحوالہ ڈاکٹر وحید مرزا، محولۂ بالا، ص ۱۰۱۔
۱۸۴۔ وحید مرزا، محولۂ بالا، ص ۱۰۱۔
۱۸۵۔ نذیر احمد، امیر خسرو کے ادبی و شعری کمالات، مشمولہ شرح کلام امیر خسرو المعروف جہانِ خسرو، مترجم فاروق ارگلی، (لاہور: مشتاق بک ڈپو، ۲۰۰۷ء)، ص ۱۴۸۔
۱۸۶۔ انعام الحق کوثر، امیر خسرو کی فارسی شاعری، مشمولہ بزم سخن، محولۂ بالا، ص ۱۸۵۔
۱۸۷۔ ممتاز حسین، محولۂ بالا، ص ۱۹۱۔ ۱۹۴۔
۱۸۸۔ شبلی نعمانی، شعر العجم، حصہ دوم، محولۂ بالا، ص ۷۹۔
۱۸۹۔ سیّد صباح الدین عبدالرحمٰن، دیباچہ، مشمولہ ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں، (اعظم گڑھ: معارف پریس، ۱۹۶۶ء)، ص ۱۔
۱۹۰۔ سحر انصاری، جنگ اور ادب، مشمولہ تنقیدی افق، (کراچی: پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، ۲۰۱۴ء)، ص ۳۹۔۴۰۔
۱۹۱۔ شبلی نعمانی، شعر العجم، حصہ دوم، محولۂ بالا، ص ۹۱۔
۱۹۲۔ عرفی، بحوالہ مولانا شبلی نعمانی، شعر العجم، حصہ دوم، محولۂ بالا، ص ۹۱۔
۱۹۳۔ حافظ، بحوالہ ایضاً
۱۹۴۔ آذری، بحوالہ ایضاً
۱۹۵۔ محمد علی صدیقی، میر خسرو کا سیاسی و سماجی پس منظر، مشمولہ افکار، امیر خسرو ایڈیشن، نومبر۔ دسمبر

۱۹۷۵ء، ص ۲۱۸۔
۱۹۶۔ شبلی نعمانی، بحوالہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دیباچہ، محولۂ بالا، ص ا۔
۱۹۷۔ امیر خسرو، بحوالہ حنیف نجمی، کلام خسرو میں گریہ، مشمولہ معارف، جون ۲۰۰۹ء، ص ۴۵۱۔
۱۹۸۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، اخبار الاخیار، بحوالہ حنیف نجمی، محولۂ بالا، ص ۴۵۱۔
۱۹۹۔ حنیف نجمی، کلام خسرو میں گریہ، محولۂ بالا، ص ۴۵۱۔
۲۰۰۔ فصیح اکمل، امیر خسرو: میوزیکل اوپیرا، (نئی دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء)، ص ۶۔۷۔
۲۰۱۔ گیان چند جین، کھڑی بولی کے ارتقاء میں امیر خسرو کا حصہ، مشمولہ شرح کلام امیر خسرو، مترجم فاروق ارگلی، محولۂ بالا، ص ۲۹۲۔
۲۰۲۔ حافظ محمود شیرانی، پنجاب میں اردو، مکتبہ معین الادب، لاہور، س ن، طبع چہارم، ص ۱۷۵۔ ۱۹۳؛ و نیز صفدر آہ، محولۂ بالا، ص ۶۶۔۹۶۔
۲۰۳۔ ظہیر فتح پوری، ہندی میں خسرو کا شعری رویہ، مشمولہ افکار، نومبر۔دسمبر ۱۹۵۰ء، محولۂ بالا، ص ۱۷۲۔ ۱۷۳۔
۲۰۴۔ امیر خسرو، بحوالہ ظہیر فتح پوری، محولۂ بالا، ص ۱۷۳۔
۲۰۵۔ ایضاً، بحوالہ وحید مرزا، محولۂ بالا، ص ۲۶۷۔
۲۰۶۔ گوپی چند نارنگ، امیر خسرو کا ہندوی کلام: استناد کا مسئلہ، محولۂ بالا، ص ۲۳۹۔
۲۰۷۔ انگد سنگھ بی اے، امیر خسرو کی ہندی شاعری، مشمولہ آجکل (دہلی)، ۱۵ جون ۱۹۴۳ء، ص ۳۳۔
۲۰۸۔ جمیل جالبی، محولۂ بالا، ص ۳۴۔
۲۰۹۔ عبدالرشید فاضل، مطلع الانوار، مشمولہ سہ ماہی اردو (کراچی)، اکتوبر۔دسمبر ۱۹۷۵ء، ص ۱۰۹۔

مآخذ

۱۔ آزاد بلگرامی، میر غلام علی، خزانۂ عامرہ، کان پور: مطبع نول کشور، ۱۹۰۰ء۔
۲۔ آزاد، محمد حسین، آبِ حیات، مرتبہ ابرار عبدالسلام، ملتان: بہاء الدین زکریا یونی ورسٹی، ۲۰۰۶ء۔
۳۔ آہ، صفدر، امیر خسرو بحیثیت ہندی شاعر، بمبئی: یونیورسل پریس، س ن۔
۴۔ اظہر، محی الدین، امیر خسرو اور علی گڑھ، علی گڑھ: نسرین پبلشنگ ہاؤس، ۱۹۸۱ء۔
۵۔ امیر خسرو، خضر خاں دیول رانی، نیشنل کمیٹی سات سو سالہ تقریبات، لاہور: استقلال پریس، ۱۹۷۵ء۔
۶۔ امیر خسرو، دیباچۂ غیر الکمال، بحوالہ جیلانی کامران، مشمولہ امیر خسرو کا صوفیانہ مسلک، (لاہور: جنگ پبلشرز، ۱۹۹۲ء)، ص ۹۳۔
۷۔ امیر خسرو، بحوالہ نجمی، حنیف، کلام خسرو میں گریہ، مشمولہ معارف، جون ۲۰۰۹ء۔
۸۔ امیر خسرو، تعلق نامہ، مشمولہ ہم سخن، مجلّہ جناح کالج، کراچی، امیر خسرو نمبر، ۱۹۷۵ء۔
۹۔ امیر خسرو، تعلق نامہ، مرتبہ، سیّد ہاشمی فرید آبادی، اورنگ آباد: مطبع اردو، ۱۹۳۳ء۔
۱۰۔ اکمل، فصیح، امیر خسرو: میوزیکل اوپیرا، نئی دہلی: ایم آر پبلی کیشنز، ۲۰۱۰ء۔

۱۱۔ انصاری، سحر، تنقیدی افق، کراچی: پاکستان اسٹڈی سینٹر، جامعہ کراچی، ۲۰۱۴ء۔

۱۲۔ انصاری، ظ، دیباچہ، مشمولہ خسرو کا ذہنی سفر، دہلی: انجمن ترقیِ اردو ہند ۱۹۸۸ء۔

۱۳۔ انصاری، نورالحسن، مقدمہ، مشمولہ امیر خسرو: احوال و آثار، مرتبہ ڈاکٹر نورالحسن انصاری، دہلی: مطبع کوہِ نور پریس، ۱۹۷۵ء۔

۱۴۔ بدایونی، ملّا عبدالقادر، منتخب التواریخ، مترجم محمود احمد فاروقی، لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز، ۱۹۶۲ء۔

۱۵۔ بدایونی، ملّا عبدالقادر، منتخب التواریخ (فارسی)، مرتبہ مولوی احمد علی، کلکتہ: دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۶۸ء۔

۱۶۔ بدایونی، نظامی، قاموسِ مشاہیر، جلد اوّل، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۲۴ء۔

۱۷۔ بریلوی، شمس، مقدمہ، مشمولہ مآثر الکرام (اردو ترجمہ)، کراچی: دارالمصنّفین، ۱۹۸۳ء۔

۱۸۔ برنی، حسن برنی، مقالاتِ برنی، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۸۶ء۔

۱۹۔ جالبی، جمیل، تاریخ ادب اردو، جلد اوّل، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۸۴ء۔

۲۰۔ جین، گیان چند، کھڑی بولی کے ارتقاء میں امیر خسرو کا حصہ، مشمولہ شرح کلام امیر خسرو، مترجم فاروق ارگلی، لاہور: مشتاق بک ڈپو، ۲۰۰۷ء۔

۲۱۔ حبیب، محمد، سوانح امیر خسرو، مترجم حیات اللہ انصاری، الٰہ آباد: ہندوستانی اکیڈمی، ۱۹۸۴ء۔

۲۲۔ حسن بی اے، ظفر، مقدمہ، مشمولہ خلاصۃ التواریخ، از سجان رائے بھنڈاری، دہلی: مطبع جی اینڈ سنس، ۱۹۱۸ء۔

۲۳۔ حسین، ممتاز، امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری، کراچی: پاکستان ہیرالڈ لمیٹڈ، ۱۹۷۵ء۔

۲۴۔ خاں، عتیق احمد، دربار داری اور خسرو کا رنگ طبیعت، مشمولہ ہم سخن، مجلّہ جناح کالج، کراچی، امیر خسرو نمبر، ۱۹۷۵ء۔

۲۵۔ خان، عصمت اللہ، ایک تہذیبی کیمیا گر، مشمولہ ہم سخن، مجلّہ جناح کالج، کراچی، امیر خسرو نمبر، ۱۹۷۵ء۔

۲۶۔ خورجوی، نقی محمد خان، حیاتِ امیر خسرو مع ایجاد موسیقی، کراچی: شیخ غلام علی اینڈ سنز، س ن۔

۲۷۔ چند، تارا، امیر خسرو اور ہندوستان، دہلی: امیر خسرو اکیڈمی، س ن۔

۲۸۔ دہلوی، سید احمد، فرہنگِ آصفیہ، جلد سوم، لاہور: مکتبۂ سہیل لمیٹڈ، ۱۹۷۴ء۔

۲۹۔ ذکاء اللہ، مولوی، تاریخ ہندوستان، جلد اوّل، علی گڑھ: مطبع انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۱۵ء۔

۳۰۔ رضوی، شفقت، امیر خسرو کے ہم عصر اردو شعرا، مشمولہ ہم سخن، مجلّہ جناح کالج، کراچی، امیر خسرو نمبر، ۱۹۷۵ء۔

۳۱۔ زاہد، انصار، امیر خسرو کی سیاسی زندگی، مشمولہ ہم سخن، مجلّہ جناح کالج، کراچی، امیر خسرو نمبر، ۱۹۷۵ء۔

۳۲۔ ساجدہ، زینت، امیر خسرو، مشمولہ صبا، حیدرآباد دکن، فروری ۱۹۶۱ء۔

۳۳۔ سجزی، سید حسن، بحوالہ اوراق پارینہ: ایک نایاب قلمی بیاض، مشمولہ نوائے ادب، بمبئی، جولائی ۱۹۵۶ء۔

۳۴۔ سجزی، میر حسن، بحوالہ تاریخ مبارک شاہی، از یحییٰ بن احمد سرہندی، مترجم ڈاکٹر آفتاب اصغر، لاہور: مرکزی اردو بورڈ۔

۳۵۔ سنگھ بی اے، انگد، امیر خسرو کی ہندی شاعری، مشمولہ آجکل، دہلی، ۱۵ جون ۱۹۴۳ء۔
۳۶۔ شیخ محمد اکرام، آب کوثر، لاہور فیروز سنز، ۱۹۶۵ء۔
۳۷۔ شیرانی، حافظ محمود، پنجاب میں اردو، آئینہ ادب، لاہور، ۱۹۷۲ء۔
۳۸۔ صدیقی، ابواللیث، حضرت امیر خسرو اور ہماری لسانی روایت، مشمولہ ہم سخن، مجلّہ جناح کالج، کراچی، امیر خسرو نمبر، ۱۹۷۵ء۔
۳۹۔ صدیقی، محمد علی، میر خسرو کا سیاسی و سماجی پس منظر، مشمولہ افکار، کراچی، امیر خسرو ایڈیشن، نومبر۔دسمبر ۱۹۷۵ء۔
۴۰۔ صلاح الدین، اقبال، خسروِ شیریں زباں، لاہور: مکتبہ میری لائبریری، س ن۔
۴۱۔ عبدالرحمٰن، سیّد صباح الدین، دیباچہ، ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں، اعظم گڑھ: معارف پریس، ۹۶۶ء۔
۴۲۔ عسکری، سید حسن، Amir Khusrau as a Historian، پٹنہ: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۱۹۹۲ء۔
۴۳۔ عصامی، فتوح السلاطین (فارسی)، مرتبہ ای ایس یوشع، مدراس: یونی ورسٹی آف مدراس، ۱۹۴۸ء۔
۴۴۔ عقیل، معین الدین، امیر خسرو فرد اور تاریخ، کراچی: ابوالکلام آزاد انسٹی ٹیوٹ، ۱۹۹۷ء۔
۴۵۔ فاضل، عبدالرشید، مطلع الانوار، مشمولہ سہ ماہی اردو، کراچی، اکتوبر۔دسمبر ۱۹۷۵ء۔
۴۶۔ فتح پوری، ظہیر، ہندی میں خسرو کا شعری رویہ، مشمولہ افکار، کراچی، نومبر۔دسمبر ۱۹۵۰ء۔
۴۷۔ فرید آبادی، سیّد ہاشمی، تاریخ مسلمانانِ پاکستان و بھارت، جلد اوّل، کراچی: انجمن ترقیٔ اردو پاکستان، ۱۹۸۷ء۔
۴۸۔ فاروقی، نثار احمد، مقدمہ، فوائد الفواد، مرتبہ: خواجہ امیر حسن علا سجزی، مترجم خواجہ حسن نظامی، دہلی: اردو اکادمی، ۱۹۹۱ء۔
۴۹۔ فرشتہ، محمد قاسم، تاریخ فرشتہ، جلد اوّل، مترجم مولوی فدا علی، حیدرآباد دکن: مطبع جامع عثمانیہ، ۱۹۲۶ء۔
۵۰۔ قادری، ایوب، تعارف، مشمولہ مآثر الکرام، از میر غلام علی آزاد بلگرامی، مترجم مولانا شاہ محمد خالد میاں فاخری، کراچی: دارالمصنّفین، ۱۹۸۳ء۔
۵۱۔ کاظمی، سیّدہ فلیحہ، مرثیہ حسن سجزی در رثای محمّد خان شہید و دیگر آثارش، مشمولہ اورینٹل کالج میگزین، لاہور، اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۳ء۔
۵۲۔ کوثر، انعام الحق، امیر خسرو کی فارسی شاعری، مشمولہ ہم سخن، مجلّہ جناح کالج، کراچی، امیر خسرو نمبر، ۱۹۷۵ء۔
۵۳۔ مارہروی، منشی محمد سعید احمد، حیاتِ خسرو، آگرہ: مطبع اکبری، ۱۹۰۳ء/۱۳۲۱ھ۔
۵۴۔ مارہروی، منشی محمد سعید احمد، حیاتِ خسرو، مشمولہ امیر خسرو، مرتبہ: شیخ سلیم احمد، دہلی: ادارۂ ادبیات دلّی، ۱۹۷۶ء۔
۵۵۔ محمود، سیّد قاسم، انسائیکلو پیڈیا پاکستانیکا، کراچی: شاہ کار بک فاؤنڈیشن، ۱۹۹۸ء۔
۵۶۔ محوی، مسعود علی، مقدمہ، مشمولہ کلیاتِ حسن سجزی، شاد ایڈیشن، حیدرآباد دکن: مکتبہ ابراہیمیہ پریس، ۱۳۵۲ھ۔
۵۷۔ مرزا، وحید، امیر خسرو، دہلی: نیشنل امیر خسرو سوسائٹی، ۱۹۸۶ء۔
۵۸۔ معین الحق، سیّد، مقدمہ، تاریخ فیروز شاہی (اردو ترجمہ)۔

۵۹۔ نارنگ، گوپی چند، امیر خسرو کا ہندی کلام مع نسخہ برلن ذخیرۂ اسپرنگر، لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۱۹۹۰ء۔
۶۰۔ نعمانی، شبلی نعمانی، شعر العجم حصہ دوم، عشرت پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۲۵۔ ۱۳۲۴ھ۔
۶۱۔ نعمانی، شبلی، حیاتِ خسرو، مشمولہ امیر خسرو، مرتبہ، شیخ سلیم احمد، دہلی: ادارۂ ادبیات دلّی، ۱۹۷۶ء۔
۶۲۔ نذیر احمد، امیر خسرو کے ادبی و شعری کمالات، مشمولہ شرح کلام امیر خسرو المعروف بہ جہانِ خسرو، مترجم فاروق ارگلی، لاہور: مشتاق بک ڈپو، ۲۰۰۷ء۔
۶۳۔ یحییٰ بن احمد سرہندی، تاریخ مبارک شاہی (فارسی)، تصحیح، محمد ہدایت حسین، کلکتہ: دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ۱۹۳۱ء۔

ویب گاہ

1. http://www.distancesfrom.com/distance-from-ravi-river-to-Okara/10616933.aspx
2. http://www.distancesfrom.com/pk/distance-from-multan-to-Depalpur-Pakistan/DistanceHistory/18050239.aspx